

تاریخ

حوت آغاز بدو فیروز عرش مدتی ۷

۳۹ مکه نصر

۹۵ مقدس درخت

۱۴۰ گویا عجب

۱۴۰ آه دانا

۱۶۸ ایک دکا

۱۸۴ آذادی

۱۹۹ سدی تیرگی

۲۱۲ نایک صفت

۲۲۲ مائی پچاند

۲۲۵ کسل

۲۴۵ دیو

حرفِ آغاز

میرزا اویس اردو ادب کا وہ واحد فن کار ہے جس کے فن کے ارتقائی مدارج بڑی حد تک اردو کے ہر افسانوی ادب کے ارتقائی مدارج کی نشان دہی کرتے ہیں۔ نثری افسانوی ادب میں ہوتا ہوا اس کی حیثیت سے میرزا نے سب سے پہلے وہ گمانیاں کھینچیں جو ان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جن کو میں داستان کی حیثیت دیتا ہوں۔ محرفوں کے خطوط کی داستانیں لکھتے دیکھتے ہی میرزا کے فن میں ایک نئی گروٹ کے اسکاٹ نمایاں ہونے لگے تھے اور یہ نیا رنگان محرفوں کے ردوان میں تشدید اور دلچسپی ہے کہ اس مجموعے کی کئی کہانیاں کئی داستانیں عناصر کی حامل ہونے کے باوجود داستانیں نہیں بن پاتیں اس نئے رجحان کی تشکیل کا دور سہارن پور قیدی محرفوں کے ردوان اور دہلی کے محرفوں کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔ یہ وہ تغیر و تبدل کا دور ہے اس لئے دور یا ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے بعد میرزا جدید داستان کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے اور اس قمر کو ان اپنے لئے سوادِ غفلت کا وہ ہر حصہ میں پوری طرح کامیاب ہوتا ہے۔ کبلی کے وہیلے میں میرزا اہلک اعلیٰ کر دیتا ہے کہ اب وہ افسانے نہیں لکھے گا بلکہ اپنی تمام تخلیقی قوتیں ڈرامے کے لیے وقف کر دے گا اس وقت سے اب تک میرزا ڈراموں کی تخلیق میں مصروف ہے۔ اس مقدمے میں مجھے صرف داستانوں اور افسانوں پر ہی بحث کرنا ہے۔

میرزا کی پہلی کتاب محرفوں کے خطوط سلسلہ میں تھی۔ یہ کتاب داستان کا مجموعہ ہے کیونکہ اس کی بیشتر کہانیاں میں داستان کی عناصر اپنے تمام لوازمات کے ساتھ موجود ہیں۔ اردو نثر کا ابتدائی دور بیشتر دوسری زبانوں کی طرح داستانوں کا دور ہے۔ کئی زبانوں میں داستان کے ساتھ ساتھ ڈراما بھی اپنی ابتدائی صورتوں میں مقبول رہا ہے لیکن اردو ادب میں یہ صورت بحال نہیں ہے۔ ہماری بیشتر

میری نظر میں میرزا ایک عظیم ادیب ہے۔ اس کے سنی یہ نہیں کہ اس کی ابتدا سے آج تک کی تمام تخلیقات عظیم ہیں۔ میرزاوند کے زمانے اور دنیائے آزدگی کی کتاباں فنی طور پر عظیم نہیں ہیں حالانکہ کتابوں کی حیثیت سے وہ بے حد دلچسپ اور مقبول ہیں۔ دنیائے آزدگی کی کتاب اپنے زمانے میں عوام میں بے حد پسند کی گئی تھیں۔ میرزاوند کے خطوط کی داستانیں اور میرزا کے ہمیشہ جدید افشاری اس کی عظمت پر دلالت ہیں۔ میرزا نے آغاز ہی سے اچھی تخلیقات پیش کیں۔ لکھنے والے کو بھی صنعت کی شروعات، علوم و معارف کی تعلیمات کا مقام نہیں دیکھیں۔ میرزا کی ہر تخلیق میں کافی دلچسپی ہے۔ خواہ وہ کسی بھی حد سے مستطی ہو۔ صحت معنوں میں عظمت اسے جدید افشاری نے ہی دی ہے۔ میرزا کے ہر کام میں دلچسپ ہوتا ہے۔ کہ ابھی تک اس کا کوئی کسب کسب نہیں پایا ہے۔ کمال ہے کہ اس نے ہر اس صنعت میں کمال حاصل کیا جو پر اس نے توجہ مرکوز کی۔

میرزا کے فن میں تہذیبیں آتی رہی ہیں۔ وہ دنیا و ترغیب کی تہذیبیں ہیں۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے۔ میرزا کے ہاں صرف ایک بار یہ تہذیب آئی اور اس کے موضوع مستقل حیثیت اختیار کر گئے۔ میرزاوند کے خطوط، دلکش روانی داستان کا مجموعہ ہے۔ لیکن میرزاوند کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے میرزا کا موضوع روانی عشق سے ہٹ کر انسانی معاشرہ کی فضا اور بالخصوص مختلف صورتوں میں روا رکھا جانے والا غم ہی جاتا ہے۔ اور اس کی تک اس کا یہی موضوع ہے۔ محبت کا موضوع اگر کہیں آتا ہے تو وہ ابھی غم کے اس منظر سے ہی اُبھر کر نکلتا ہے۔ میرزاوند کے زمانے میں داستان کا رنگ بہت پھیلا ہے۔ دنیائے آزدگی معاشرے پر ایک کامیابی ہے۔ میرزاوند کے زمانے میں میرزاوند کے خطوط کی تکنیک اور دنیائے آزدگی کے موضوعات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ گویا میرزا کی کثرتِ دہدول میں جدید افشاری کے بیچ اُسی وقت جوئے جا چکے تھے جب وہ خیالِ حواش اور شہادت کا قیدی نہیں تھا۔ داستانیں لکھ رہا تھا۔ داستان کے جملہ عناصر پر مکمل بحث کا یہ موقع نہیں۔ اس موضوع پر میں نے اپنی کتاب "میرزا ادیب اور اس کا فن" میں تفصیلی بحث کی ہے۔ یہاں چند اُشادوں پر ہی اکتفا کروں گا۔ داستان کا رنگ

مستعد فن نگار کا ہے جو اصولی مسرت یا تفریح ایک حد تک ہر صنف ادب کا ایک مقصد
مزد ہوتا ہے لیکن بعض اصناف میں کوئی اور مقصد اس مقصد پر حاوی ہو جاتا ہے۔ لیکن
داستان میں عموماً تفریح ہی سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے یہ اودیات ہے کہ ذہین قاری ان
داستانوں میں زندگی کے اسرار کا کش کر لیتا ہے۔ عموماً داستان میں منطقی استدلال، عقلی و نفسیاتی
نکتہ آخری اور تجزیہ کو دخل نہیں ہوتا۔ داستان کی دنیا ایک تصوراتی دنیا ہوتی ہے۔ رومانی
فضا میں خیر و شر کے جھگڑے طے پاتے ہیں۔ یوں کہ فوج ہمیشہ خیر کی ہوتی ہے اور قاری ٹیکسی
حاصل کرتا ہے۔ انسانی کی آرزو میں جب زندگی میں پوری نہیں ہوتی تو وہ معجزوں کا انتقا
کرنے لگتا ہے۔ جہاں چہ مافوق الفطرت واقعات سے داستانیں بھری پڑی ہیں۔ پُر اسرار
اور تخیل انگیز فضا اسی لئے داستان کا لازمی حصہ گئی ہے کہ یہ مافوق الفطرت عنصر کا لازمی نتیجہ
ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ داستان پڑھنے کے بعد جو اہم ترین بات ذہن میں رہ جاتی ہے
وہ داستان کی تخیل انگیز، پُر اسرار، رومانی، مافوق الفطرت قسم کی، یعنی فضا ہے جہاں انسانی
ناممکنی کر ممکن محسوس کرتا ہے۔

عموماً اردو کے خطوط کی بیشتر داستانوں میں یہ عناصر اردو فضا موجود ہے لیکن وقت کے
تقاضوں کے مطابق میرزا نے چند تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ میرزا کے بیشتر نظر داستان کی فضا ہے
وہ جانتا ہے کہ آج کا ذہین قاری محض مافوق الفطرت عنصر بدعتیں نہیں رکھتا اور اسے بخون
پیوں کی کہانیوں اور معجزوں کے ذکر سے نہیں بسلا یا جاسکتا۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ داستان
تھہر گئی کا دلچسپ ترین ذریعہ ہے۔ چنانچہ میرزا نے مافوق الفطرت عنصر اور واقعات سے
دامن ہچایا اور یہی فضا بعض دوسرے ذرائع سے پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ادیبوں اس کی
داستانیں داستانوں کا پہلا حراز بنتی ہیں۔ یہ فضا پیدا کرنے کا بہت کارآمد اور اہم ذریعہ تھا جس
نے اختیار کیا ہے یہ ہے کہ وہ قاری کو ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جو اس کی روزمرہ کی دنیا سے
بالکل مختلف ہے، بہت دود ہے اور جیسے اس نے یا تو دیکھا نہیں یا محض اُس کی چند

ہمکنیاں ہی دیکھی ہیں لیکن اُسے دیکھنے کا وہ ہمیشہ آرزو مند رہا ہے۔ کوئی زمانہ نہ ملے، یا شخص
 بھلا وقت یا مصلہ ہم سے جتنا دیر چاہتا ہے اتنا ہی دیر ملتی فضا کا لباس اس کے گرد مضبوط
 ہوتا جاتا ہے۔ میرزا نے اس اصول کو کھانا اور استعمال کیا ہے۔ بادشاہ و قہر و انج کے ماحول کا
 حصہ نہیں ہیں اور کھشد و صف و مزہ زندگی کا حصہ نہیں ہیں بلکہ ماضی کی یادگار ہیں جو ہم ہیں ماضی
 میں لے جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ ان کے ذریعہ اجنبی سے فضا پیدا کر لیتا ہے۔ پھر میرزا کی داستانوں
 میں تجزیہ اور منطقی و عقلی استدلال بہت کم ہے۔ حقیقت یہاں بھی ایک کھیل ہے۔ داستان خواہ و خیر
 صفا کی ہر بات کھسکے کھسکے اہل کی سمیرا کی ہر یا سارے کے ہاشا کی عقل کے مقابلے میں جتنی ہر کھسکے
 پر ہا کھسکے ہے۔ ان داستانوں میں جو یہ افسانے کی حقیقت پسندی اور تجربے کا پایہ گراں آجاتے
 کی سکت نہیں۔ داستان اور فخر کی صفت ناقص ہے۔

پھر میرزا کا نام ہی بھی کس دہائی، اجنبی دنیا میں لے جاتا ہے۔ میرزا اور دکاندار اس
 لحاظ سے بہت کامیاب ہے کہ یہ دہائی اور داستان کی فضا پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ جانتا ہے
 اس کا مقابلہ آسانی سے بداد بھاری سے کیا جاسکتا ہے۔ میرزا کا نام وہی میں آتے ہی ایک
 جی، اجنبی، دُعا افتادہ دنیا کا تصور ذہن میں جاگ اٹھتا ہے۔ میرزا اُس بیکار زندگی کی عظمت
 مان جاتا ہے جس کی داستانیں وہ اپنے دوست کو لکھ کر بھیجتا ہے۔ اس نے جہاں بھی میرزا
 کا دستور کا ذکر کیا ہے قاری کہہ دے کہ میرزا کی ہر بات روزمرہ کی دنیا کو فروغ دے جاتا ہے
 داستان کی فضا پیدا کرنے کے لیے میرزا نے ایک مخصوص پیرایہ اختیار اختیار کیا ہے۔ جہاں
 مافوق الفطرت عنصر سے واسطہ کشی شرط ہو اور محض فنی کمال اور اسلوب پر ہی تکیہ ہو وہاں کام
 دشوار ہو جاتا ہے۔ میرزا اس امتحان میں پورا ناکرا ہے۔ اور ذرا عجیب کے علاوہ میرزا نے اجنبی کھسکا
 کے استعمال سے بھی یہ فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ صبح ذیل چند نام خاص طور پر قابل
 ذکر ہیں۔

طیوش، سارے، محوی، بلا میرزا، ہر مرزا، زمانہ، ذمہ داری، عطلہ، اندازہ، کھیل، فخری، فخر

یوں میرزا کی ان داستانوں میں تجزیہ اور اسرار کی فضا قائم ہوجاتی ہے۔ اور واقعات کی پچھلی
 کا انداز اس فضا کو موزون حضرت ایسا بھی بنا دیتا ہے لیکن اس کے باوجود میرزا کے کردار کا
 ہر شرابا و دیوانہوں کے کردار نہیں ہیں۔ یہ کردار ہماری جتنی بھی دنیا کے باشندے ہیں میرزا
 نے داستان کی روایت کا احترام کرتے ہوئے تجزیہ نفس سے ان داستانوں میں اجتہاد کیا ہے۔
 لیکن بعض روایات کا غلام نہیں ہیں۔

داستان میں طویل بھی ہیں اور مختصر بھی۔ ایک ایک سے اور قدرہ قدرہ داستان و داستان
 بھی۔ میرزا کی داستانیں مختصر ہیں۔

خیر و شر کی جنگ پرانی داستانوں کا اہم موضوع ہوا کرتا تھا۔ میرزا کے ہاں یہ موضوع
 روایتی انداز میں بھی پیش ہوا ہے اور نئے انداز میں بھی۔ دیکھا جائے تو ایک لحاظ سے یہ
 میرزا کا مستقل موضوع ہے۔ وہ اعلیٰ اقتدار کا عہدار ہے اور کرائی عالم اور معاشرتی تبدیلی
 کا دشمن ہے۔ یہ موضوع میرزا کے زمانے میں سب سے بڑے انداز سے پیش ہو رہا ہے یعنی کچھ عرصہ
 پہلے قدیم بنگالہ میرزا کے خطوط کی بیشتر داستانیں روایت کی اساس پر مبنی ہیں۔ میرزا
 کے زمانے کی کہانیوں میں جہاں داستان کی روایتی فضا ایک حد تک موجود ہے وہاں ایک خاص
 سماجی مفرد بھی ابھی میں شامل ہے۔ گویا داستانوں کا سن اس بار گراں سے عروج پر ہوا
 ہے۔ لیکن اپنی جگہ ان میں بھی بے حد دلچسپی کا سامنا موجود ہے۔ یہ کہانیاں محض گویائی، اختصار
 آفریں، سحر آلود واقعات کا ایک طویل سلسلہ عشق و محبت کی بے سرو پا داستانیں اس لئے
 نہیں ہیں کہ صاحبِ فکر و تفریح کا کھیلے۔ یہ دلچسپی نہیں رکھتا کہ وہ اپنے اندر کے ماحول سے
 آنکھیں بند کر لے۔ آج محض عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے شہزادوں اور شہزادیوں کی
 کہانیاں ہماری تسکین کا سامان اس وقت تک نہیں ہیں جتنیں جب تک ان میں بعض معاشرتی
 ان فی یا نفسانی مسائل کے شعور کا احساس موجود نہ ہو۔ میرزا کی ان کہانیوں میں اندھرتا
 افلاک میں بھی، نئے ماحول کا شعور، نئی زندگی اور زندگی سے کہیں نہ ڈرتے والے

رشتے کا احساس بڑی شدت سے موجود ہے اسی لئے وہ غلم اور غم سے نڈھال ہو کر
 ریلوے دار اختیار نہیں کر لیتا بلکہ علمِ ہنر و فن و تبحر کے ساتھ ہیوں تو یہ زمین سے رشتہ کسی نہ
 کسی طرح ہر تخلیق میں نظر آسکتا ہے لیکن میرزا ان فن کاروں میں سے ہے جنہیں اس
 رشتے کا شعور بھی ہوتا ہے۔ میرزا کے ہاں شعور اور لا شعور ایک دوسرے کے معاون ہیں
 کر کام کرتے ہیں۔ اور یہ ان لوگوں کا اعجاز ہوتا ہے جو ضمیرِ عظمت کی راہوں پر گامزن ہوتے
 ہیں۔ جون بول میرزا کی زندگی اُسکے برصغیر گئی اور اس کا زندگی کا تجربہ اور شاہد رہی کر گیا
 توں توں اسے اپنے معاشرے میں جانوں بجانب پھیلے ہوئے طرح طرح کے ظلم کا احساس
 شدید سے شدید تر ہونے لگا۔ قبل از جنگ کی سب کاوسی، دورانی جنگ کی سب کی اور بعد
 از جنگ کی ہر شاکی کے نتائج میں پیدا ہونے والی معاشی تباہی حالی اور بے امیدانی نے اس کا
 سکھ بھی ٹوٹ لیا اور ہر ہند کے دلوں میں اپنے غیر ملکی حکام کے خلاف غلط فہم برپا
 نفرت نے اس کے دل میں گھر کر لیا اور یہ احساس کہ امت سے ہندوستانی غلامی کی بھڑوں کو
 مانا جا آتا تھا۔ کھ کر ان سے پیدا کرنے لگے ہیں اس کے لئے سخت تکلیف، دہائی گید، مذہب
 کی گرفت، لوگوں کے دل و دماغ پر گزردہ پڑی ہوئی اسے صاف نظر آ رہی تھی۔ اُس کے چاروں
 جانب ایک نفسا نفسی کا عالم تھا۔ خود غرضی اور بے حس اور غلام کو قبول کر کے بیٹھ جانے
 اور برداشت کرتے دھچ سے پیدل ہونے والی نضا اس کے دل و دماغ پر ہر لحظہ فشر زنی
 کرنے لگی۔ جتنا تجربہ تمام جزئیات اس شدت سے انکسار سے کہ اب اس کے فن کا مقصد فنکار
 درمیان پڑانی داستانوں میں معاشرے کے آگام اور خامیوں اور اجتماعی، انکی چیزوں کا شعور
 ضروری نہیں ہوتا تھا لیکن شعور اور کے رومان کی کتابوں میں یہ شعور اس شدت سے
 در آیا کہ نہ اند مودع کی ہم آہنگی مروج ہو کر رہ گئی۔ ہمارے وہ ایک داخلی، طرح اٹھانے
 ہمارے اصلاح کا جذبہ نہ صرف غالب ہے بلکہ ہمارے مختلف کردار و اشکاف انداز سے اس کا
 ایک واضح کی طرح اٹھارہ ہی کہتے ہیں یہ ضرورت سے زیادہ ہمیدگی ہی شعور کا سامنا

کی کہانیوں کا نقشہ بن جاتی ہے۔ باہر مگر ان اور دوسرے نظام کے متعلقہ جذبہ ابھرتا تھا اس پر کسی قسم کی پابندی اُس کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ یہ سچے مصلح کا جذبہ تھا۔ فن کار کا نہیں۔ اصلاح ایک عظیم مقصد ہے اور فن بھی اس مقصد کا ذریعہ ہی سکتا ہے لیکن اسٹیل کا واقعات اور بار بار اعلیٰ فن پارے کا نقشہ بن جاتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کہانیوں میں فن کار اوگھ رہا ہے اور مصلح پوری طرح بیدار ہے۔ توازن اور ہم آہنگی کی یہ کمی محض عارضی تھی اور میر نے بعد ازاں اپنے افسانوں میں یہ توازن اور موزون اور فن کی تکمیل ہم آہنگی قائم کر لی۔

اس دور میں سے میں نے میرزا کی دو کہانیاں منتخب کی ہیں۔ "مکہ مصر" اور "مقدس درخت" پہلی کہانی روایتی داستان کے انداز پر لکھی گئی ہے اور صحرائورد کے خطوط میں سے لی گئی ہے۔ دوسری کہانی میں جہاں ایک مددگ داستان کا اثر موجود ہے وہاں اس میں معاشرتی مسائل کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے۔ یہ دونوں داستانیں اپنے اپنے انداز میں منفرد ہیں اور ان پر کچھ بحث بے جا نہ ہوگی۔

"مکہ مصر" صحرائورد کے خطوط کی تیسری داستان ہے۔ صحرائورد "دخترِ صحرا" ایسے ناسوں کی طرح آغاز داستان ہی میں یہ نام بھی اجنبیت کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ مصر سے واقعہ اوپر اسرارہ کہانیاں وابستہ ہیں۔ جیسے کہ قات کو نام لیتے ہی جنوں پریوں کی دو قسم کہانیاں ذہن میں ابھر آتی ہیں جہاں سے متعلق ہیں اسی طرح داستان میں مصر کا ذکر بھی ایسا ہی تاثر پیدا کرتا ہے۔ ہم اس داستان کے زمانے سے بہت دور ہیں اور مصر دیوانہ بالخصوص تھڑے مصر دیوانہ کا ذکر ہمارے لئے انتہائی رومانی ہے جتنا کہ قات پاپانے چین کا فرعون کا نام ڈالتا۔ خود داستانی روایت کا حصہ ہے۔ اس داستان کا لہذا ماحول معجزاتیات کے اس قدیم رومانی ، داستانی ابد رواہتی ہے کہ یہ داستان داستان کے جدیدی کی تحقیق معلوم ہونے لگی ہے۔

معبود روحِ ہدائی ماضی کا اشارہ ہے۔ فرعون کے تہ خاتمے میں خود شہنشاہِ لاشعہ پڑی
 ہیں۔ بڑا اجنبی ماحول ہے۔ موسیٰ، انگلی، میرونی، افریحی، زاحمت، وقاصد آتشیں ایسے نام
 اجنبیت کی فضا کو آخر تک سمجھائے رکھتے ہیں۔ ناموں کا اثر اس داستان میں بہت شدید ہے
 شاہی جوش اور شان و شوکت اور طاقت کے مظاہرے عام ہیں۔ قتل و غارت جو اکثر مطلق لفظ
 بادشاہوں کا شیعہ رہا ہے اور سازشیں جو اہل کے درباروں سے ہمیشہ مخصوص رہی ہیں اس
 داستان کے پس منظر میں صاف صاف نظر آتی ہیں۔ تحیر کی فضا پیدا کرنے کے لئے مصنف نے
 تمام ممکن ذرائع استعمال کر لئے ہیں۔ افوق الفطرت عنصر کہاں بلا واسطہ موجود ہے بمعبر
 کا کاہن پیشگوئی کرتا ہے جو حرفِ بحرف درست ثابت ہوتی ہے اور اس پیشگوئی پر داستان
 کے آخری اور اہم ترین حصوں کا درود دار ہے۔ تحیر کی فضا پوری داستان پر طاری ہے نہایت
 اور ماحول ہی ایسا ہے کہ اگر مصنف دنیا کو کشش نہ بھی کرتا تو بھی بڑی حد تک یہ فضا قائم
 ہو جاتی لیکن میرزا نے دوسرے ذرائع استعمال کر کے اس فضا کو شدید تر بنا دیا ہے۔ فرعون
 کی لاش علی محفوظ کے لئے ایک تہ خاتمے میں پڑی ہے انگلی سے ہماری طاقت اسی جگہ
 ہوتی ہے۔ یہاں اُسے دھوکے میں دھرائے نظر آتے ہیں۔ سارا ماحول پُر اسرار اور اجنبی
 ہے اور آقا و داستان ہی میں قادی کے ذہن پہلے مسلط ہو جاتا ہے کہ آخر تک ساتھ چلتا ہے۔
 تحیر کی اس فضا کا احساس تو صحرا الہد کے خط کے مطالعے سے ہی ہونے لگا ہے۔ دبی
 نیاں آفتاب اس امر کی وضاحت کے لئے نقل کرتا ہوں:

آج تہا سے دور افتادہ صحرا اندو دوست کو تہا ری شورشِ افراتو دنیا کے
 دلچسپ مناظر کو چھوٹے ہوئے ہونے جن سال گذر چکے ہیں۔ ان میں ملک
 میں میری نگاہوں سے بہت آنکریں مچاؤں، ہر ایک پہاڑوں، مٹی اور ریت
 کے مہیب قدوں، گنجان اور بلند درختوں کے علاوہ شاد و نادر ہی کوئی
 چیز دیکھی ہے۔ اب مجھے قدرت کے ان لڑنے خیز مناظر سے محبت ہی ہو گئی

ہے اور جیسے جیسے پر سے قدم آگے بڑھتے جاتے ہیں مٹے مٹے میرٹ
انجیر واقعات ملتے آتے ہیں۔ دوست! میں ایک ایسی دلقور روایت
انجیر دنیا میں ساتھی کے۔ اہل میں کی دلچسپیاں تمہارے قصور است بھی جانتی ہیں۔

میں مظلوم ہوتا ہے جیسے صحرا فردنی اوراق کسی اور دنیا سے ہول رہا ہے۔ ایسی دنیا
میں ہمارے روزمرہ کی دنیا سے بہت مختلف ہے اور جہاں قدم قدم پر تجویز اور طبع واقعات
سے ساتھ پڑتا ہے۔

صحرا فرد تک یہ کہانی جس قدر جیسے سے پہنچی ہے وہ بھی بہت پُر اسرار اور دلچسپ
ہے۔ صحرا میں بلو موسم کے جھوٹے آندھی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ فضا تاریک ہو جاتی ہے،
آندھی میں ایسا شور مچا ہے جیسے بلاشبہ پہنچ رہی ہوں۔ آواز آندھی ختم ہوتی ہے اور ریت شہ
ہوتی ہے وہ اپنے ساتھی نہرام کو آواز دیتا ہے کہ کیا دیکھتا ہے کہ جھوٹے میں اس کے
حلقہ ایک پُر اسرار شخص جو بہت لڑکا ہے موجود ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے طلسم ہر شر کا
کوئی گردہ اپنی آغوش میں کر رہا ہو، جیسے پُرانی جنوں اور جوتوں کی کہانیوں کا کوئی دیو
بڑھا آ رہا ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے یہ آندھی میں صحرا کی روزمرہ زندگی کا سہہ ہیں اور بڑھے
کا وہاں اس وقت ملتا ہے اتفاق ہے مصنف کے ظہر سے اس واقعہ کا ذکر ہوں ہر کہہ کہ
داستان کو مافوق الفطرت واقعات کے بغیر ہی مافوق الفطرت فضا حاصل ہو گئی ہے۔ یہ وہ
پُر حواس ہے جو صحرا فرد کو ملکہ مسحر کی داستان کا سہہ دیتا ہے۔

مقدس وہ خشت کی ابتدا میں صحرا فرد نے جو خط اپنے دوست کے نام لکھا ہے اس
میں اسے صحرا کی داستان اور خط میں مددگار کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ جہاں تک موضوع
کی سنجیدگی اور ثقافت کا تعلق ہے یہ کہانی "مقدس" دیو کا شہر ہے جس میں شاعری ہوتی ہے۔
اس میں داستان کے عناصر موجود ضرور ہیں لیکن بے حد مکرور ہونے لگے ہیں۔ ان طریقہ بیان اور
تخیل کی رنگ آمیزی سے کمال پیدا ہوتی ہے وہ بڑی حد تک داستان کی فضا سے ملتی جلتی

ہے۔ محرابِ رد کا خط مضمونی کا رنگ لٹے چھٹے ہے اور واضح گفت اور واضح انداز میں موضوع کا تعین کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ اس داستان کا مصنف داستان گو کون ہے اور اس کا بیان موضوع کے تعین کے بارے میں ذیل کے چند اقتباسات کا مطالعہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

”ظلم اور مظلومیت کا قصہ ہم صرف شہری دنیا ہی تک محدود نہیں اس کا جوہر مظلومیت ہے آب و گہا زمین پر بھی پایا جاتا ہے اور بعض اوقات تو تہذیب و تمدن سے ناماشائے محض ہستیاں ایسا ایسا ظلم کرتی ہیں اور انسان کو کر ایسے ایسے رحمتہ ظریفوں سے ہلاک کرتی ہیں کہ شبہ کے خاتمہ پر یہ دنیا و مایہ بھی ابی ہو کر شیں کر کا شپ کا شپ، ٹھیں۔“

اور

..... اگر شہروں میں حصولِ مراعات کی چوس و سوسائٹی کے فحاشی کی سخت گیری اور مراعات کی سخت جبر و تشدد تقسیم کے سائے میں انسانیت کی بوٹیاں توڑی جاتی ہیں تو ان وادق صحرا کے بیٹھے پر بھی ہڈی اداہم کے دامن میں انسانیت کی رگیں کٹی جاتی ہیں۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ ظلم و مظلومیت کے باب میں جو کچھ تہذیب و تمدن کی بنیادوں پر ہوتا ہے وہی وحشت و بربریت کی گود میں بھی ہوتا ہے۔ پھر جس طرح شہروں میں عظیم سامری قوتوں کے لئے ان مری کی ذات مقدس کا حضور جوتابہ اس طرح ان وحشت و درندگی کی پردہ پوشی ہونے لگتی ہے اور ان میں بھی ظلم کا خاتمہ کرنے کے لئے وحشیانہ فتنوں میں سے ایک وحشی انسان پیدا ہو جاتا ہے اور اپنے مقصد پر اپنا سب کچھ نثار دیتا ہے۔ یہ داستان میرے اس بیان کی تصدیق کرے گی اور یقیناً تمہیں بھی درس کی صداقت کا قائل ہونا پڑے گا۔“

مگر یہ داستانِ علم کے خلاف ایک آواز ہے اور اس مجموعے کی دوسری کہانیوں کی طرح یہ بھی نزعِ انسانی معاشرے کی اصلاح کا مقصد لے کر آئی ہے۔ اس داستان میں داستانی رنگ کے علاوہ موضوع و تکنیک کی ہم آہنگی مصنف اور قارئین کے خط و اختلافت اور اواز کے باوجود قائم ہے۔ ایک درخت نے دیو یا دیوتا کا روپ دھار لیا ہے، مذہب کے لہرے میں جو کچھ تھوڑا اور خود غرضی بھیرے معاشرے پر حکومت کرتے ہیں بھاری ان کا تانہ ہے۔ یہ تانہ قدرت ہے کہ فنی کے گھر سے بدی اور بدی کے گھر سے نیکی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ آندے کے گھر ابراہیم پیدا ہوئے اور بھاری کے گھر مرم پیدا ہوئے جو جوئے خانہ راشی کے ظلم کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ بناتے۔

اس داستان کا ایک اور موضوع عورت کی جہ بیسی ہے۔ عورت کی جہ بیسی بھی ظلم کی ایک شکل ہے۔ واقعہ مزینہ، حکارت، راستہ اور دوسری نئی نئی کہانیاں کسی نہ کسی طرح ظلم کی پٹی میں ہیں پس لیکن داستان میں یہ خیال پوری طرح سمویا ہوا ہے کہ عورتوں ہی پر کیا سبوت ہے ظلم کی پٹی میں تو سارا زمانہ پس رہا ہے۔ میرزا ظلم کی قسمیں نہیں بتاتا وہ تو ہر ظلم کو صرف ظلم سمجھتا ہے اور اس کے خلاف ظلم بغاوت بلند کر رہا ہے۔ راشی مذہبی ظلم کی علامت ہے لیکن ظلم کا درخت، کتنا بھی مضبوط ہو قربانی اور بغاوت کی آگ اسے جلا کر رکھ کر دیتا ہے دوسرے الفاظ میں خیر کو شر بد و فتنہ و فحش حاصل ہوتی ہے۔ یوں گویا اس داستان کا راستہ بھر روایت سے قائم نظر آتا ہے۔

ما فوق الفطرت محض اس داستان میں بلا واسطہ موجود نہیں ہے لیکن راشی کی پرستش اور احمد علی کی آمد و خیرہ کو کچھ اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ فضا پُر اسرار سی جہ جاتی ہے۔ واقعات غیر منطقی ہیں اور اچانک پیش آکھانے کی وجہ سے ما فوق الفطرت معلوم ہوتے ہیں لیکن اسرار کے مادل چھٹتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز بھی ما فوق الفطرت نہ تھی۔ قربانی کا یا ایک قاتل ہو جانا، حکارت کو زخمی ہو جانا، راستہ کے باپ کا قتل اتاری کی میں سایوں کا

نظر اکمل منساہ فضاؤں کا برہمیل سا ہو جانا، مجبورِ نیرِ نری کا نذرِ آتش ہو جانا اس میں سے کسی صورت کا بھاگتے ہوئے نظر آنا تمام واقعات ابتدائی بافرقِ الفطرت اور غیر منطقی معلوم ہوتے ہیں اور تخیل کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مصنوعی انداز سے بافرقِ الفطرت قسم کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

میتھ، واسٹ، ہنوشی، راسام، ہنر بونا، سمارت، نرود، مزینہ، اندا، بلاطم، عنونی، بلاطی، تاجی، اورت، سمرم، اسٹا اور یوق وغیرہ قسم کے ناموں سے اجنبیت کا سامنا پیدا کرنے کی شعوری کوشش بھی موجود ہے۔

عشق کی بلاخیزی اور راولوشن کی دشواری داستان کا ایک اہم عنصر ہے۔ یہاں بھی موجود ہے۔ سمرم کا عشق داستانی اور روایتی ہے اور وہ قدم قدم پر مشکلات اور خطرات درپاز ہے۔

(۲)

داستان کے اسلوب کا بامداد اور تخیلاتی دنیاؤں کی کشش میرزا کو زیادہ دیرانی گرفت میں نہیں رکھ سکی۔ جو ممکن ہے کہ شروع میں داستان کی طرف میرزا کا رجحان قرار کے بارے میں جذبہ کا نتیجہ ہو لیکن اگر یہ درست ہے تو بھی یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ میرزا فرار کی دلدل سے بہت جلد باہر نکل کر معاشرے کی تمام ملاحضاتی قوتوں کے خلاف نبرہ آزمایا ہو گیا۔ بنیادی طور پر وہ حقیقت پسند اور حقیقت پسند تھا۔ وہ ایسے مایہ ناز لوگوں میں سے نہیں تھا جو ایک باورِ فراد کے چکر یا رومان کی دلدل میں پھنس کر اسی کے چورہتے ہیں۔ رومان ٹھیکہ کشی ہے اور سرچشمہ مسرت بھی ہے لیکن اس کی ضرورت سے زیادہ محبتِ فن کی حقیقت سے دور لے جاتی ہے۔ صرف اس کی مناسب آمیزش ہی فن میں حصہ پیدا کر سکتی ہے۔ ایسنس (ESSENCE) کی زیادہ مقدار ہر شے کو بد مزہ کر دیتی ہے اسی طرح رومان پر ضرورت سے زیادہ توجہ فن پارے کی حقیقت سے دور رکھتی ہے۔ جدید افسانے کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں حقیقت پسندی اور تخیل کی رنگ آمیزی کی انتہائی مناسب آمیزش ہوتی

ہے۔ ان آمیزش کا تناسب مختلف افراد میں مختلف ضرور ہوتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بیشتر حقیقت پسند ادیب بھی کسی نہ کسی لحاظ سے، کسی نہ کسی حد تک رومانی ضرور ہوتے ہیں اور دنیا کا تمام عظیم ادب رومان کی آمیزش کے بغیر تخلیق نہیں ہو سکا۔ آج رومان ہر شے کا امت صورت میں بنتا ہے کہ محض رومان ہی اول و آخر مقصد ہو کر رہ جائے۔ دیکھا جائے تو ایک لحاظ سے ہر ادب کے بیشتر بڑے ادیب کسی نہ کسی لحاظ سے رومانی ہیں۔ پریم چند اور مجاہد جید یا درم جو اردو افسانے ابتداءً دور سے متعلق ہیں رومانی ہیں، اور حقیقت پسند بھی یہی مثال کر سکتے ہیں۔ چند اور احمد ندیم قاسمی کا ہے۔ وہ جدید ضرور ہیں، لیکن رومان سے انہوں نے قطعی طور پر رشتہ نہیں توڑا۔ جدید رافضائے محض حصولِ حظ یا محض جذبات کی سستی نسکیں پر اکتفا نہیں کرتا۔ آج زندگی کی وسعتوں اور گہرائیوں کے شعور کے ساتھ ساتھ فن کے پیرایہ ہائے اظہار بھی متاثر ہو رہے ہیں اور فن کار اپنی اہلیت اور تجربے کے مطابق زندگی کے مختلف انواع و اقسام کی پردہ نشانی کا کام بھی کرتا ہے اور خیالاتی حظ بھی مہیا کرتا ہے۔ واقعات، ماحول، کردار، جذبات اور احساسات کی تصویر کشی کے علاوہ وہ ان کے پس منظر میں کام کرنے والی پیچیدہ قوتوں اور محرکات کا تجزیہ بھی کرتا ہے اور فن کی ذاتی زندگی کے علاوہ اس کے اجتماعی رشتوں کا مواد بھی کرتا ہے۔ ہمارے افسانوں میں زندگی کا شعور تین صورتوں میں نظر آتا ہے:

(۱) پیچیدہ کی صورت میں

(۲) گہرائی کی صورت میں

(۳) پیچیدہ اور گہرائی ہر دو کی صورت میں

پیچیدہ کی صورت یہ ہے کہ فن کار ایک ہی قسم کے واقعات یا ایک کردار یا ماحول سے متعلق واقعات اور قارئین کی ایک طویل فہرست مہیا کرنے پر اکتفا کرتا ہے یا زندگی کے ظاہری تنوع کی رنگ و رنگ تصویریں پیش کر دیتا ہے۔ گہرائی کی صورت یہ ہے کہ مصنف

ہر واقعہ اور ہر کردار کا تجزیہ کرتا ہے اور دنیاوی عوامل اور محرکات کی نشانی دہی کرتا ہوتا ہے۔ زندگی کی پوشیدہ قوتوں اور حقیقتوں کو سمجھنے میں قاری کی راہنمائی کرتا ہے۔ ایسا مصنف سائنات و واقعات پر نگاہ نہیں کرتا بلکہ واقعات میں ایک حقیقت پرست اور منطقی تعلق تلاش کرتا ہے۔ پھیلنے والی محض ظاہری یا بیرونی شے ہے اور گہرائی، روح کا سانس ہے۔ کھیتی ہے گہرائی اور پری شے نہیں ہے۔ اس کا احساس دلانا ہی فن کا راز کما ہے۔ سچ، کبھی بالکل سچ ہوتا ہے کہ وہاں واقعات و مناظر محض اشیاء ہیں کسی اور حقیقت کی طرف براہی اشارہ نہ کرے۔ پردوں میں نمایاں ہے۔ عام آنکھ ان کو نہیں دیکھ سکتی، صاحبِ نظر فن کا راز کمال یہ ہے کہ وہ ان حقائق کو اس انداز سے نمایاں کرتا ہے کہ قاری حقائق کے شعور کے ساتھ ساتھ مسرت بھی حاصل کرتا ہے۔ زندگی میں ہر شے کی طرح ہر مصنف ادب اور ہر فن کی کچھ حدود ہیں جن سے تجاوز گہرائی کی طرف لے جاتا ہے۔ اشارے اور علامتیں ادب و فن کا حسن ہیں، کبھی بعض شاعر اور ادیب اشاروں اور علامتوں کو اتنا مبہم بنا دیتے ہیں کہ ان کے ہاں فنی قواعد قائم نہیں رہتا اور فن بارہ پسلی پر چلتا ہے۔ یہ لوگ نہ تو زندگی کا مشاہدہ رکھتے ہیں نہ تجزیہ، عموماً ان کا علم محض کتابی ہوتا ہے، فحش کے جانے کی کڑی کی طرح وہ اپنے اور گرد ایسی علامتوں اور اشاروں کا جال جھنٹے رہتے ہیں جو کسی علاج بھی قابلِ تدریس نہیں، ہوتیں راتوں نے سُن رکھا ہوتا ہے یا کہیں پر مٹھا ہوتا ہے کہ زندگی کی گہرائیوں کو اشاروں اور علامتوں کے ذریعے نمایاں کیا جاسکتا ہے اور یوں فن میں کچھ اشکال ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس بات کا سہارا لے کر وہ فن کو معرّض بنا ڈالتے ہیں۔ ایسے لوگ قاری کی کسی گہرائی، کسی حقیقت کی طرف صحیح راہنمائی نہیں کر سکتے۔ جو شخص واقعی زندگی کی گہرائیوں سے واقف ہے اور حقیقتوں کا شعور رکھتا ہے اس کا فن کبھی بے معنی اور گنجلک نہیں ہوگا۔ اور اُسے سمجھنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اگر فن کار کے پاس کہنے کے لئے واقعی کوئی بات ہے اور وہ قوتِ انداز بھی رکھتا ہے تو وہ ایک عمارتِ خیالی یا کسی شے کا ایک واضح تصور دینے میں کبھی ناکام نہیں ہوتا۔

اور اگر اس کے ذہن میں دائروں کے مافقہ ہی سلسلوں اور کڑی کے جالوں کے سوا کچھ نہیں ہے تو وہ ہمیں پریشان کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ فن کار کی معراج یہ ہے کہ اُس کی نگر زندگی کے پھیلاؤ اور گہرائی ہر دو سے آشنا ہوتی ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی مصنف زندگی کے کسی ایک پہلو کی گہرائیوں سے پوری طرح واقف ہو تا ہے اور یہ بھی کہ وہ زندگی کے جملہ مختلف پہلوؤں پر فن کارانہ نظر رکھتا ہے، پہلا مصنف عظیم ہے اور دوسرا عظیم تر۔ میرزا کا تعلق اسی دوسری قسم سے ہے۔ اس کے فن میں علامتوں اور اشاروں کا استعمال ضرور ہوا ہے لیکن اُس کی تحریر عمدہ کبھی نہیں بنی۔ آسکر وائلڈ کی طرح وہ شدیدائے فن بھی ہے اور خائے حیات بھی۔

میرزا ادیب کے اعنائوں میں زندگی کی ہر جہتی اور موضوعات کے تنوع کے باوجود ایک قدر مشترک موجود ہے جو موضوع ہی کی شکل رکھتی ہے۔ اس موضوع کا تعین تصور اوزد کے در مان پر بحث کے دوران کیا جا چکا ہے۔ میرزا کی ددروس نظروں نے اپنے ارد گرد بھیلی ہوئی زندگی میں غم کی کئی صورتوں کا مشاہدہ اور تجربہ کیا ہے۔ زندگی کا حسن اور اس کی سربلندی اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہیں لیکن دیکھوں عرو میوں اور حتی دامنوں کے انبوہ کثیر اور جم غفیر میں یہ خوبیاں وہی ہوئی نظر آتی ہیں اور یوں زندگی کا مطالعہ میرزا کی تخلیقات میں المیہ رنگ کے غلبے کا سبب بن جاتا ہے۔ اور دیکھا جائے تو دنیا بھر کے ادب میں عظیم ترین غم پاسبان وہی ہیں جہں میں زندگی کا المیہ پہلو غالب ہے۔ زندگی کی المناک حقیقتیں (جنہیں غموس ہیں کہ ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی بھر کی خوشی، زندگی بھر کا سکون ایک المناک حادثہ ختم کر دیتا ہے لیکن کوئی ایک مسرت اعجاز واقعہ زندگی بھر کے غموں کا مداوا کبھی نہیں بن سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی اپنے غم کو سراپہ حیات سمجھ کر اس ایک ناقصے کی یاد دل سے لٹائے پھرے۔ زندگی کی ہر شے میں جو فنا ہو جانے کا کار بار شامل ہے وہ اکثر واقعات کو الم اعجاز بنائے ہوئے ہے ہمیشہ خوش رہنے کے سوا ان کو یا تو جانور دنیا

پڑتا ہے یا دیوتا اور ایسا شخص نہیں کر سکتا۔ اکثر لوگ جانوروں کی ہی بے حس کا شکار ہو کر خوش رہتے ہیں۔ یہ بھی بڑا عظم ہے۔ ان کی بے حسی غفلت سے بے باطمینان کرتی ہے لیکن زندگی کل اور زندہ و مایع تھا ہر کتنا بھی خوش نظر آئے زندگی کی المٹان کا قائل خدو رہتا ہے۔ میرزا ادیب مسرت سے نا آشنا نہیں ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ زندگی کی المٹان کی اس کی مسرت انگریزی سے کہیں زیادہ قوی ہے۔ ایسے شخص کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں یا تو وہ دکھوں سے فراق کی تلاش کرتا ہے اور غفلت کی دنیاؤں میں ہمیشہ کے لئے ڈوب جاتا ہے یا پھر دکھوں پر کچھ دیر ڈوب رہنے کے بعد ابھرتا ہے اور یوں تجربہ اور مشاہدہ کی قوتوں کی مدد سے دکھوں کے سامنے اکھڑتا ہوتا ہے۔ میرزا نے یہی کیا ہے وہ دکھوں کی دلدل میں پھنس کر نہیں سو گیا بلکہ صاحبِ پرش فہم کی طرح اس نے زندگی کے غم سے لوگوں کو آشنا کرنے کا ارادہ کیا اور انہیں ہر اُس عظم کے خلاف ابھارا جو اس زندگی میں اُسے نظر آیا۔ دیکھ اس کی زندگی، اس کے تجربے اور اس کے مشاہدے کا اہم ترین حصہ ہیں۔ محرمیوں کو اس نے شخصِ فاضل سے نہیں دیکھا بلکہ خود محرمی کیا ہے۔ زندگی کی لاتعداد نعمتوں سے محرم ہو کر اس آگ میں جل کر دیکھتا ہے۔ معاشرے کے مصائب کا اس نے محل کے جبر کے سے یا ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بار بار نہیں لیا بلکہ اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی زندگی کا حصہ بن کر تجربے سے ان کا شعور حاصل کیا ہے۔ میرزا کے جدید انسانوں میں سستی جنبا بقیہ نہیں ہے۔ سستی جنبا بقیہ وہ غلط ہے جس نے تجربہ کے زمانہ کی کامیابیوں کو عظیم فہم پارے اور اعلیٰ حید کو عظیم فہم کا نہیں بننے دیا۔

میرزا کے فہم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا فہم گیرائی اور گہرائی بہ خصوصیات کا حامل ہے اور یہی جدید انسان کا طرزِ اختیار ہے۔ میں ایک اور جگہ عرض کر چکا ہوں کہ سچا اور عظیم فہم حصولِ مسرت، ادبِ برائے ادبِ ادا ادبِ برائے حیات کے نظریوں کے قوام سے پیدا ہوتا ہے۔ میرزا کے جدید انسان نے اس اصول پر پورے اُترتے ہیں یہی

وجہ ہے کہ نہ تو وہ اپنی ذات میں گم ہو کر رہ گیا ہے اور نہ دیکھوں سے فرار کے راستے پر گامزن ہوا ہے بلکہ ذات، ماحول، معاشرے اور کائنات کی اہم ناک حقیقتوں سے بہرہ ور ہو کر دوسروں کو اپنا ہمنوا بنا رہا ہے۔

میتھیو، کرناؤٹے ٹیکسپیئر کے پاس سے میں کہا ہے کہ وہ تمام دیکھ ہوا انسان کی کائناتی روح کو برداشت کرنا پڑتے ہیں، انسان کی وہ تمام کمزوریاں جو اس کی تباہی کا سبب بنتی ہیں، تمام غم جو اس کی کمر ہمت توڑ دیتے ہیں عورت ٹیکسپیئر کی عظیم تحریروں میں نمایاں ہیں۔ ان الفاظ اعلیٰ میں رٹا ادیب پر بھی ہوتا ہے۔ قلوب میں کوہِ رستم کی غلط فہمی سے پہلے کے نئے ہیں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں میرٹا ادیب اور ٹیکسپیئر کے فی کا مقابلہ نہیں کر رہا بلکہ یہ بنا کر چاہتا ہوں کہ دونوں کے ہاں زندگی کے براہِ راست تجربے کی فراوانی ہے۔ معاشرے پر خود فرض لوگوں کے تجسس نے اسے ان کے خفاوات جنات پر آگیا۔ اعلیٰ قدوں سے لوگوں کی بے تعلقی نے اس کے فی کو تقدیر حیات اور خود مست حیات کے رجاؤں دیے دکھایا اور بُرائیوں کے اٹھ بھرے میں امیدوں سے اس نے کبھی نہیں پھرنا دکھایا اور ان کے لوگوں سے بھربے ہوئے معاشرے اور دنیا میں اس نے مافی کھاتاں، دینہ اور شرم رخ کے پہلو ان کی ایسے کرداروں کو دکھائے جو سورج کی کرنوں کی طرح تاجناک ہیں۔ لیکن ان کی آہنگی کو ٹیکسپیئر والی آنکھیں کتنی گہری ہیں۔۔۔ اُسے اس کا بھی علم ہے۔ اہرے سب باتیں اس حقیقت دنیا کی ہیں۔ ایک کردار، ایک بات بھی ان جدید افسانوں میں ایسی نہیں جو غیر منطقی حیر حقیقتی اور ناقابلِ غم ہیں عظیم فی کا رکے لیے ان حقائق کو قصہ ہی مانتی نہیں ہوتا بلکہ ان کا ایسے انداز سے اظہار بھی ضروری ہے جو جمالیاتی غلط بھی مہیا کر سکے میرٹا ادیب فی کا رکے ان فرائض سے پس منظر اکام ہے اور مدد برآ بھی ہوتا ہے۔

غم زندگی گناہ نہیں ہے بلکہ، غم زندگی کے بعد ابھرنے اور سنبھلنے کی کوشش، ذکرِ گناہ ہے یہ سوچ کر دکھان کا مستند ہے کراں ہے جو ہمارے کشتی امید کو پاش پاش کرنے کی قوت رکھتا

ہے، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا میرزا کے نزدیک گناہِ عظیم ہے۔ اس کی تمام تحلیل و تفاسیر میں اس رجحان سے صاف و روشنی نظر آتی ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ جب تک بغاوت نہ کی جائے گی عظیم کی اقدار متزلزل نہیں ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی میں ہر طرف عروسی کے شہید اس کے ساتھ ساتھ میرزا کے ہاں رجائیت کی وہ لہر رواں دواں نظر آتی ہے جو حضوں کی فزائی میں انسان کو نہ صرف زندہ رکھتی ہے بلکہ اُسے عظیم تر مقام تک بھی پہنچا کرتی ہے اور ان معتقد کے سہول کی قوت بھی دیتی ہے۔ یہ رجحان یا خیال میرزا نے خود پر بطاری نہیں کیا بلکہ تجربے نے اُسے دیا ہے۔ یہ حقائق ہیں میرزا کی ذات اور اس کے فن کی ایک اور خصوصیت جو بھی متعارف کرانے میں اوروہ ہے جو ہے کی صداقت اور خلوصِ الفاہ۔ خلوص کا لفظ اپنے عام معنوں میں بہت بدنام ہو چکا ہے لیکن تجربے اور مشاہدے کو مصلحت کو فنی اور تعصب کے بڑا شیم سے بچ کر فن کے سانچوں میں ڈھالنے کو اس سے بہتر نام نہیں دیا جاسکتا۔ یہاں ایک اور بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ بعض ادیب اپنی تحلیل و تفاسیر کو یہ کہہ کر گور رکھ دیتا بنا دیتے ہیں کہ ان کا تجربہ ہی بڑا پیچیدہ ہے۔ اس سے زیادہ احمقانہ بات ادیب کی زبان سے نہیں کہل سکتی۔ ادیب عام آدمی سے بڑا محض اس لئے ہے کہ جہاں اُس کے ہاں جذبے کی شدت اور خیالات، علامات، مفادات اور مشاہدے کی فراوانی ہے وہاں وہ اس قابل بھی ہے کہ ذہن پر مرسم ہونے والی تصویروں کو ایسے پیرائے میں بیان بھی کر سکے کہ قاری تک اس کا ابلاغ آسانی سے ہو جائے۔ پسیلیوں میں بات کرنے کا ایک بڑا نامزد یہ ہے کہ لوگ خبر میں مختلف معنی کا ش کرنے لگتے ہیں اور یوں ایک قسم کی مصنوعی پیدگی اور ذومعنویت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ جو صنعت اپنے تجربے اور مشاہدے کو اور ذہن پر مرسم ہونے والے نقوش کو اپنی قوتِ تخلیق، شعور اور انداز کی مدد سے ایک واضح صورت میں پیش نہیں کر سکتا اُسے ابھی مزید ریاضی کی ضرورت ہے۔ اگر فنی کارِ شعور نے کام لینا پسند نہیں کرتا اور لا شعور کے دائروں میں ہی بگڑا رہتا ہے تو

کھیلنے ابھی وہ حیوانی سطح سے آگے نہیں بڑھا اور ابھی اُسے ارتقاء کی کئی اور منازل ملے کہنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ انسانی سطح پر کھڑا ہو سکے۔

اس بحث سے جہاں اچھے ادب کی چند خصوصیات کا ذکر مقصود تھا وہاں اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ کرنا بھی پیش نظر تھا کہ میرزا کے فن میں یہ خوبیاں موجود ہیں۔ میرزا نے عظیم فن کے تقاضوں کو اپنے جدید افسانوں میں بطریق احسن پورا کیا ہے نہ زندگی پر اس کی نظر محنت گہری ہے۔ وہ ذہن حرکات کا تجزیہ کر سکتا ہے بلکہ مختلف حرکات اور واقعات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مختلف افسانوں کے ایک دوسرے پر دار و ہونے والے اثرات کی نوعیت، گونا گونی اور وحدت سے بھی آگاہ ہے۔ وہ ان سب کے باہمی رشتوں کو سمجھتا ہے اور اشیاء اور واقعات کے اشارے بن سچائی کی نماندگی کرتے ہیں ان تک ہر آسانی پہنچ جاتا ہے پھر میرزا کا فن کسی ایک منزل کا میرزا نہیں سمجھ گیا۔ اس کے قلم کو کبھی سستائے کی امانت نہیں ملی۔ بیش حد صاف کی طرح وہ ہمیشہ لکھتا رہے مگر فرق گو کہ پوری کی طرح اس کے فن میں کسی قسم کا زوال نہیں آیا۔ اس کے بہت سے افسانے پیچھے ایسے عظیم فن کاروں کی صف میں جگہ پاتے ہیں وہ پیچھے سے کم صرف اس لحاظ سے ہے کہ پیچھے کے مقابلے پر اس کی تخلیقات کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ جہاں تک معیار کا تعلق ہے میرزا کے افسانے پیچھے کے افسانوں کا معیار رکھتے ہیں۔

جدید افسانوں میں میرزا کے موضوعات کی نشاندہی ڈاکٹر عبادت بریلوی نے "تخلیق کے پیش لفظ میں بڑی خوبی اور وضاحت سے کی ہے اور مجھے ان کی آواز سے پورا اتفاق ہے۔ معاشرے کے ناسور اور زندگی کی محرومیاں اس کے محبوب موضوع ہیں۔ محرومی کا تعلق صرف مالی طور پر غریب لوگوں سے نہیں ہے بلکہ مختلف صورتوں میں محرومی کا دکھ ہر طبقہ آنا میں دواں دواں ہے۔ میرزا نے زندگی کو بلا واسطہ بھی دیکھا ہے اور اپنی ذات کے وسیلے سے بھی اس کا مطالعہ کیا ہے اور یوں وہ زندگی کی گہرائیوں کو دیکھنے

اور سمجھنے کے قابل ہو گیا ہے۔ صحرا اور درے کے رومان اور دنیا کے آرزو میں موضوع اور فنی کی جو ہم آہنگی موضوع سے شدید طور پر متاثر ہونے کی وجہ سے موضوع پر گہری تھی وہ اس کے پیشہ افسانوں میں مکمل طور پر موجود ہے۔ فنی توازن پر اب اس کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ اس کے پھر متزلزل ہونے کا اسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میرزا کے افسانوں کے دو مجموعے "داؤ" اور "دیواریں" اب نایاب ہیں لیکن ان کے منتخب افسانے کبلیں میں شامل ہیں۔ میں نے ان افسانوں میں سے گونگی محبت اور آن داتا منتخب کئے ہیں۔ میری بہت خواہش تھی کہ "دیو" بھی اس مجموعے میں شامل ہو لیکن ضخامت بڑھ جانے کا خوف ستوا رہا۔ "دیو" آسکر وائلڈ کے افسانے "فوش باش شہزادہ" The Happy Prince کی نہ صرف یاد دلاتا ہے بلکہ اسی سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ "آن داتا" کا موضوع غلام جاس کے "آندی" سے مختلف ہے لیکن یہ دونوں افسانے ایک ہی طرح کی عظمت کے حامل ہیں۔ "آندی" ان افسانوں میں سے ہے جو جذباتیت سے بچ کر لکھے جاتے ہیں اور جو مصنف کی عظمت اور شہرت پر دال ہوتے ہیں۔ "آن داتا" بھی اسی قسم کا افسانہ ہے۔ ان دونوں افسانوں میں مصنفین کا انداز فکر ایک رنگ کا حامل ہے۔ اس مجموعے کے بعد کے افسانوں میں سے "مانی پھان" "کبلیں" اور "دیز" اس مجموعے میں شامل ہیں۔ میں نے ترتیب میں ان افسانوں کو سب سے آخر میں اس لئے رکھا ہے کہ اندازاً افسانے تخلیقی ادوار کی ترتیب سے سامنے آئیں۔ مجھے سب سے زیادہ پریشانی جنگل میں سے انتخاب کے وقت پیش آئی کیونکہ ہر افسانہ میرا راستہ روکے کھڑا تھا کہ جا ایجا مت۔ چنانچہ میں نے موضوعات کا تعویج قائم رکھنے کی کوشش کی تو ہر شکل کسی فیصلے پر پہنچ سکا ایک دکان "موضوع کے لحاظ سے منظر ہے اور یہ اس مجموعے میں شامل ہے۔ سینتیس سال بعد "مرکز" اور "آزادی" کے موضوع بڑی حد تک بڑی حد تک ملتے جلتے ہیں۔ میں نے ان میں سے "آزادی" کا انتخاب کیا ہے۔ "شتر مرغ" ایسا اعلیٰ افسانہ ہے جس میں میرزا کو دارنگاری کی ایک اعلیٰ مثال

پیش کرنا ہے اس مجموعے میں ضرور شامل ہونا اگر میں ایسے ہی تین انسانوں کو اپنا چھانوں گا اور دوسرے کا انتخاب نہ کر سکے ہوتا تو بدولت تیرگی میرزا کے چند علامتی انسانوں کی نامزدگی کرتا ہے۔ ایک مصنف اور آرٹسٹ کا ہیرو کا موضوع ایک ہی ہے۔ میں نے اس سوچے میں ایک مصنف کو شامل کیا ہے کہ یہ ایک حد تک میرزا کی ذات کا عکس بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔

میں یہاں ہر انسان پر الگ الگ بحث کا ارادہ نہیں رکھتا لیکن ان انسانوں کی چند خصوصیات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ محبت کے موضوع پر میرزا نے بہت کم جدید انسانے لکھے ہیں۔ اس مجموعے میں صرف گوئی محبت شامی ہے۔ دوسرا انسان جو اس انسانے کا ہر لحاظ سے ہم پلہ ہے بدھو میاں ہے۔ ان انسانوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ میرزا سطحیت اور جذباتیت کا قائل نہیں۔ عشق اگر جذبہ پر ڈھپلن کی کوئی پابندی مضبوط کی کوئی نہیں نہ لکھے تو اس کا گھر پاگل خانہ ہے۔ میرزا کے نزدیک محبت ایک فطری جذبہ ہے جس کی نیکی ضروری ہے۔ محبت اور جنس کا تعلق ان کی وابستگی ہے۔ محبت جہاں کئی بیچ در بیچ ذہنی کیفیات اور غیر مرئی تعلقات و احساسات کا اظہار ہے وہاں یہ جنس کی تسکین کا ذریعہ اور جنس خواہش کا اظہار بھی ہے۔ جنسی محبت انسان کا پہلی تقاضا ہے جسے صرف موت ہی ختم کر سکتی ہے نہ ہی ہاتھ اناک، انگلیوں کے کسی بھی عضو کی خرابی یا ملی اس جذبے کو موت کی فیدہ نہیں سلا سکتی صرف خارجی طور پر دبا سکتی ہے۔ لیکن دبا کر یہ جذبہ شدید تر ہو جاتا ہے اور پھر آتش فشاں کی طرح پھوٹ نکلتا ہے جس کے سامنے اس جذبے کے مالک کو عالم بے اختیاری میں سپر زندہ ہونا ہی پڑتا ہے۔ گوئی محبت اور بدھو میاں اسی نظر سے کی تشریح کرتے ہیں۔ گوئی کے پاس قوت گویائی نہیں ہے اور بدھو میاں بڑی حد تک محفل سے محروم ہیں۔ اور گویائی کے چہرے کو چھپانے کا انداز اور پلٹ کر دیکھنے لیکن یہ تینوں کو دیر محبت کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ وہ صورت حال ہے جو عظیم ایسے کو ختم دیتی ہے۔ یہ وہ محرومی ہے جو امیر عرب کا فرقہ روا نہیں دیکھتی ہے اور جس کی نظر میں آت اور غلام صبا برابر ہیں۔

گوئی و یک بہترین ہوجاتی ہے اور ویک بھی مرہا تہ ہے۔ اس واقعے سے ہمارے عقیدہ ہا
کو یہ اہمیان ضرور حاصل ہوتا ہے کہ گوئی نے غیر ارادی طور پر قدرت سے اس علم ہا بد لیا
ہے ہر اس سے اس کی قرب گویائی کچھیں کر دیا تھا لیکن قدرت ہی کی طرف سے ہونے والے
اس علم کا کیا علاج ہے ہر اس نے اقتدا سے اس کا خاوند و یک ہمیں کر کے قدرت نے گوئی سے
قرب گویائی ہمیں تھی لیکن اس کے جنسی تھانے قوت ہلے جا سکتے تھے۔ اسی طرح بدھو میاں اگر
کم عقل ہیں اور باجی کا ہرہ بدنا ہے تو اس میں بھی قدرت کا قصور ہے۔ قدرت کی جانب سے ظاہر
دیا رکھے جانے والے علم کا احساس یوں میرزا کے فہ کا ایک موضوع ہی جاتا ہے۔ پھر حقیقت کہ
ہر عیب ہا شخص کے دل میں محبت کا جذبہ ضرور پیدا ہوتا ہے اس علم کا احساس کو شدید بھی کرتا ہے
اور کم بھی۔ شدید اس صورت میں کہ گوئی کی طرح ایسا شخص تڑپ تڑپ کر مریختے اور کم اس صورت
میں کہ بدھو میاں اور باجی ایسے لوگ آپس میں محبت کے کئے زندگی کی تھیں کو بھول کر ایک دوسرے
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے زندگی گزار دیں۔ — قدرت کی طرف سے ظاہر
دیا رکھے جانے والے علم کے خلاف میرزا نے شکایت ضرور کی ہے لیکن اس نے وہ ناہنشاہ طریقہ ترائی
وہ اختیار نہیں کیا جوئی۔ م راشد باثری اور شیلے نے اختیار کیا تھا اور جس پر یہ تھیں شامل خود
بھی مستحق عمل ہر اندر وہ سکے تھے۔ راشد خدا کا باجی تھا اگر آپ یہ بغاوت سرور ہمہ گیری ہے۔ بالکل
آخری عمر میں اپنے کردار اور اعمال ہا پیشانی ہر کردار اور شیلے نے ایک بے انصاف خدا کو رو کر کے
ہیں تھے خدا کی تخلیق کی کو تشکی کی وہ اس کے کسی کام نہ آسکتے شیلے اور باثری پر یہ وعدہ کہ عری
اور ناہنگی کے زمانے میں پرورشایہی صورت راشد کے ساتھ بھی رہی ہو۔ میرزا پر یہ وعدہ نہیں آیا
بغاوت کو میرزا نے تقدس کا دھرم دیا ہے۔ یہ ہماو کا دوسرا نام ہے لیکن خدا اس کی بے انصافی
کے سلسلہ میں میرزا نے خود کو بھی بے نتیجہ اور تکلیف دہ کش کش کا شکر نہیں ہوتے دیا۔ اس نے
وہ عتبہ شروع ہی میں اخذ کر لیا تھا جس پر دوسرے بہت دیر سے پہنچ سکے۔ اور پھر میرزا یہ بھی
جانتا ہے کہ اگر قدرت نے بدھو میاں اور باجی کو بعض نعمتوں سے محروم رکھا ہے تو ان کے دل

وہ محبت میں تڑپا کر دی ہے جو ان کی محرومی کا علاج بن جاتی ہے اور گوئی ہے زبان ہے تو رپک کے ساتھ ختم ہو کر وہ کاغذی بھی تو ہو جاتی ہے۔ مگر ہاں میرا جہاں نظرت کے ظلم کا شاکی ہے وہاں اس کی حنا یا ت کا شکر گزار بھی ہے۔

میرزا کا سب سے بڑا موضوع وہ انسانی معاشرہ ہے جس کے تعداد و عمروں کے باوجود ان گفت افراد زندگی کی فریٹیوں سے محروم ہیں۔ وہ معاشرہ جو اعلیٰ کردار کی شخصیتوں کو محرومی کی آگ میں جلاتا ہے اور حقوق کو مسد ہائے تو قیر و عزت پر بشکا کر دیتا ہے، جو اپنے وقت کے عظیم زندہ انسانوں کو تعریف تو دے سکتا ہے لیکن ان کا پیٹ نہیں بھر سکتا اور انہیں بھر کر مار ڈالتا ہے۔ لوگ آدمیہ کے ہیرو و شہاب کی پرستش کرتے ہیں، خمر میں اس کا بُت نصب کیا گیا ہے وہ قوم کا ہیرو ہے لیکن قوم اس کی بنیادی ضروریات میں بھی کمی نہیں کر سکتی ایک صنف چند دن ہمان کی حیثیت سے ہر طرح کا آرام حاصل کرتا ہے لیکن ہمدی بھر کا مرنے لگتا ہے۔ شہرت اور تعریف ہیٹ تو نہیں بھر سکتیں، سیستیس سال بعد، ”مرکز“ اور ”آزادی“ معاشرے کے غریب اور مفلوک افعال لوگوں کی محرومیوں اور نیشیوں اور مجبوریوں کی کمائیاں ہیں۔ معاشرہ کیجئے شریف آدمی کو محرم بناؤ اللہ ہے سیستیس سال بعد اس سوال کا جواب ہے۔ معاشرہ کا ظلم کس طرح لفظ کی عزت نفس کو ختم کر دیتا ہے ”مرکز“ اور ”آزادی“ اس سوال کا جواب دیتے ہیں۔ یہ موضوع میرزا ادیب کے علاوہ فن کارانہ پاکبستی سے صرف شوکت صدیقی نے پیش کئے ہیں۔

کھلی اور تنگی کے افسانوں میں میرزا کا اسلوب جذباتیت سے پاک ہے۔ اسی لئے وہ اے حمید سے بہت بلند ہے۔ وہ حقیقت پسند طبیعت کا مالک ہے اور الفاظ کو خیالات کے تابع رکھتا ہے۔ ان افسانوں میں اس کا اظہار و اشکات انداز اختیار نہیں کرنا۔ ان میں ایک معلم ضرور چھپا ہوا ہے لیکن میرزا کا فن وہ اخلاقی کمائیوں والا فن نہیں جہاں فن ختم ہوجاتا ہے۔ یہ اختر احن صرف محض غصہ کے زمانے اور دنیا کے آکڑو پہنچ ہی وارد ہوتا ہے۔ لہٰذا جبکہ افسانوں میں میرزا کہیں بھی سیدھا سادا واقعہ یا مصلح یا معلم بن کر سامنے نہیں آتا بلکہ ایک

ہا یکدست فی کار کی طرح اپنی پیغام مرفوع اور فن کی ہم آہنگی اور توازن کے تمام تقاضے پورے کر دیتا ہے۔ وہ معلم ضرور ہے لیکن زندگی کی اعلیٰ کائناتی اقدار کا۔ میرن کے افسانوں میں ایک ایک اندیشی خلی سوجھ ہے جو ہمارے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ یہ فنی وہ DETACHMENT ہے جو ٹیکسیر کا طرؤا قیاد ہے اور بعض بڑے فن کاروں میں ٹیکسیر سے قدرے مختلف انداز میں ملتی ہے۔ ایڈمنٹو لسن کے قول کے مطابق گلیور کے سفر ناموں میں فن کار نظروں سے اوجھل رہتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک یہ بذوقی ہنگی کہ وہ اپنے ہیرو کو اپنی ذات سے ہم آہنگ کرے یا اپنے ہیرو کے کارناموں کو اپنا بن کر پیش کرے یا قاری اور قلمی کے درمیان محلی ہو کر اپنے جذبات کا اظہار کرے۔ یہی وہ DETACHMENT ہے جس کی جانب میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں۔ ٹیکسیر کے ان یہ فنی دور سے تمام مصنفین سے زیادہ نمایاں ہے۔ اگر فن کار صرت اپنی ذات ہی میں الجھ کر رہ جائے تو کوئی کام نہ ہو سکتا اور زندگی کی وہ رنگارنگی جو ٹیکسیر کے ان موجد ہے تا ممکن الحصول شے ہو جائے۔ سو فٹ اور ہارس برنارڈ شا کے ان اپنی اپنی جگہ یہ خصوصیت موجد ہے لیکن اس کا احساس جس شدت سے ٹیکسیر کے ان ہوتا ہے کسی اور فن کار کے فن میں نہیں ہر کہ مثلاً گلیور کے سفر نامے میں ہی سو فٹ اپنے قصبات کو دہاتے ہیں کامیاب نہیں ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کے قصبات جو اس کتاب کی تخلیق کا سبب بنے ہیں۔ شا کے ڈرامے ایڈمنٹو کلینز اور شیر میں محقق درباری تیش ایک لحاظ سے بظاہر الگ بیٹھا نظر آتا ہے لیکن ڈرامے کے اختتام پر اور پیش لفظ اور شا کے عام اسلوب، انداز اس کی دیگر کتب کے مطالعے سے پتہ چل جاتا ہے کہ ڈرامے میں شروع سے آخر تک ایک لحاظ سے مولے شا کی اپنی ذات کے کچھ نہ تھا اس کو اپنے نظریات سے جذباتی لگاؤ ہے جس کا اظہار ہو جاتا ہے لیکن شاید عظیم فن کار تھا اور وہ

درد اور تشویش تاری کو یہ احساس دلاتے ہیں بڑی حد تک کامیاب ہے کہ اس نے اپنی ذات کو
 ڈھلے میں کسی طرح بھی غفل نہیں چھوڑتے وہ محض ہونے کی صورت صرف یہ نہیں کہ مصنف
 کرداروں کی پچھلے کہانی میں ایک خود بخود مسبقہ کی حیثیت سے داخل ہو کر اپنے آثار
 پیش کرنے لگے بلکہ یہ بھی ہے کہ اپنے تعصبات، پسند اور ناپسند کو کہانی میں ایک خاص رنگ
 بھرنے کی اجازت دے دے۔ پہلی صورت ایک بہت بڑا فنی نقص ہے لیکن دوسری صورت
 ایسا ہے کہ اس سے گریز ناممکن ہے۔ جو معروفیت اور داخلی اور خارجی حقائق کی کچھ بھر
 خاکسپیر کے ہاں ملتی ہے وہ تو کہیں اور نظر نہیں آتی۔ اپنے نظریات کا پرچار بھی تو ایک حد تک
 محض ہونے کے مترادف ہے۔ خاکسپیر تو اس سے بھی بچ کر چلنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ
 بھی ترداد امنی سے بچ نہیں سکا کہ فن کی شخصیت کو اس کی تخلیق سے مکمل طور پر جدا لکھنا
 ناممکن ہے۔ چنانچہ بعض مقامات پر اس نے اسلام کے خلاف چند تعصباتی اشارے کئے ہیں۔
 گویا ایڈمنڈ سوس کی بات بھی مشروط طور پر ہی تسلیم کی جا سکتی ہے۔ اور ان نظریات کی ترویج
 و تشریح کو عیب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگرچہ کارموضوع اور فن کی کنہ ہم ہنگی قائم کر نہیں
 کامیاب ہے تو خواہ وہ خاکسپیر والی عظمت نہ بھی حاصل کر سکے جاری نظروں میں وہ عظیم ہے۔
 کیونکہ کسی بھی مصنف کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ محض معروفی اعداد پر سوچے اور اپنی ذات
 اور تعصبات کو اپنی تخلیق سے بالکل جدا رکھے۔ ڈراما تاریخ اور بڑی حد تک افسانے میں
 اس رجحان کی بہت ضرورت اور اہمیت ہوتی ہے کیونکہ وہاں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور
 کرداروں کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی مقصود ہوتی ہے۔ لیکن ادبی فن پارے میں خواہ وہ ڈراما
 ہو یا افسانہ مصنف کی ذات اور اس کے تعصبات کی وجہ پر اس کی تخلیق سے الگ نہیں کر سکتے۔
 کسی حد تک مصنف کی ذات کا اثر اس کی تخلیق میں ضرور ملے گا۔ خاکسپیر ایسے لوگ بہت کم
 ہوتے ہیں۔ سوئٹ اور تھامس جیون اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کی - DETACHMENT -
 انشاید معروفی نظر خاکسپیر سے مختلف اس لئے ہے کہ خاکسپیر کے ہاں اُس افسانے کے نظریات

کی تردید اور بلند واپسند کا اظہار نہیں ہوتا جیسے ان مصنفین کے ہاں ہو سکتا ہے۔ ہم اس
 DETACHMENT کو مصنوعی DETACHMENT کہہ سکتے ہیں۔ اب میں واضح طور
 پر یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ گوئی سے اس DETACHMENT کو مصنوعی کہنا ہے۔ میرا فخر
 میں غنہ ہائے کا نقص ہرگز نہیں ہے بلکہ حقیقی ہے کیونکہ تفسیر کے تحت DETACHMENT
 ہزاروں سال بعد ہی کسی ایک آجودانہ کو پیش آتی ہے۔ ہمارے ہاں بڑی حد تک سائنس میں
 مشینیں یہ بات ضرور تھی۔ سائنس دانوں میں ایک حد تک لازماً امد کے ہاں اس کا احساس
 ہو آج۔ وہ مصنفین جن کا ذکر میں نے اوپر کیا۔ جہاں پہلے نظریات کی تردید و تفسیر اور تعصبات
 کے غلبہ کے باوجود قاری کو یہ احساس دلانے میں کامیاب ہیں کہ وہ معروضی طور پر سمجھ لیتے
 ہیں خواہ انھیں اپنے موضوع کے گتہ بھی ہدایتی نکا دکھیں نہ ہو۔ یہ ہدایتی تعلق فی الواقع
 کے اہم مطالعے کے دوران ظاہر ہو سکتا ہے، جو قوس و زنی شخصیت اور اس کی دوسری تخلیقات
 نے طے کیے۔ یہ واضح ہو جاتا ہے۔ میرزا ادیب کے بعد افسانوں میں ہیں وہی دوسری قسم
 کی یعنی مصنوعی DETACHMENT مٹی ہے۔ زندگی کے ہائے میں میرزا کے واضح نظریات
 ہیں۔ فن کے ہائے میں بھی اس کے قہر میں کسی قسم کی داخلی پیچیدگی نہیں ہے۔ لیکن وہ
 ان افسانوں میں کہیں بھی یہ احساس نہیں دیتا کہ وہ ہدایتی ہے اور کوئی نظر ہم پر
 نظر نہ بٹھاتا ہے اور یہ ایسے فن کا۔ کی ہر زندگی میں نظریات کی دشمنی میں راستہ دیکھنے کا
 ناکامی ہے کامیابی کی بہت بڑی دلیل ہے۔ میرزا نے تجربات و مشاہدات سے جو کچھ سیکھا ہے
 وہ چند نظریات کی شکل میں اس کے افسانوں میں بھرا ہوا ہے۔ یوں تو یہ نظریات صحرا میں
 کے موناخی اور ویسٹ آف آریزونا میں بھی موجود ہیں لیکن بعد افسانوں میں موضوع اور فن کی
 ہمہ پہنچی نے میرزا کے افسانوں کو فنی لحاظ سے بہت اونچا مقام دیا ہے۔ جبکہ تذکرہ بالا
 وفاق کتابوں میں یہ نظریات میرزا سے حیرت کا مانہ طریق پر جمع کر دیئے گئے ہیں۔ جنگل اند
 گیندوں کا دھواں میں میرزا بھی فن کے ساتھ فن کی انتہائی غلطیوں پر غور کر رہا ہے۔

اس نے خود کو موضوع کی ذات میں گم کر کے ابھارا ہے اور یوں موضوعیت کو معرفت و حقیقت کے ایک عرض آئینہ و نام کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ شاعری میں موضوعیت کو نہ صرف بہت بڑی قربانی بلکہ ایک لازماً سمجھا جاتا ہے لیکن اضافہ لگا کر کے ہاں اگر یہ رجحان ایک دو اضافوں سے آگے بڑھ جائے تو بہت بڑا نقص ہوتا ہے کیونکہ یہ جذباتیت پیدا کر کے اُسے محض کسی نقص کا شکار بنے۔ اور شوکت قاضی اور وہ کرام مصنفین جنھوں نے اسلامی باتوں کو اعلیٰ کی شکل دی ہے اُسے محض کچھ ایسی نئی سطح پر جذباتیت کے اُسے پشت میں میرزا اویس کے جدید اضافوں میں یہ نقص نہیں ہے۔ اس کے علاوہ احمد علیہ قاسمی، کریم چند، بی بی عصمت اور شوکت صدیقی وغیرہ کے ہاں بھی یہ قربانی باقی جاتی ہے۔ عظیم کے شروع کے اضافے میرزا کو ایک حد تک روحانی جذباتیت کے حامل ہیں لیکن اب ان کے اضافوں کا انداز بدلتا ہوا ہے کہ ان میں بہت زیادہ باتیں ہیں لیکن ان میں حقیقت پسندی بھی اتنی ہی زیادہ ہے اس نے ایک توازن سائنس کے ہاں پیدا ہو گیا ہے۔ یہ واقعہ ہے میرزا اویس پر جس کو کبھی روحانیت کا الزام لگایا تھا اس کا المیہ کہ لکھلکے کے مجموعوں پر کسی طرح بھی نہیں جوتی تھی یہ دیکھنے ان کتابوں کے مطالعہ کے بغیر ہی گئی تھی۔ ذریعہ تشویش کے افواہ نہیں ہو سہذا کہ چھپا ہے وقار عظیم نے میرزا کے بارے میں یہ دیکھا اس میں دی ہے اس وقت تک میرزا کے باقی اضافوں کا مجموعہ ”جنگل“ منظر عام پر آچکا تھا اور لکھلکے کے کئی اضافے اس سے بھی پہلے چھپ چکے تھے۔ ان حالات میں وقار عظیم کا میرزا کے بارے میں یہ غور و تمیز غیر مستغنا نہ ہو جاتا ہے کہ وقار عظیم نے جس کی اس کتابوں پر کوئی توجہ دینے بغیر اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

(متم)

ہر نئے صنعت کار ویت سے رابطہ اپنے پیشروں اور ہم عصروں کی تخلیقات کے ساتھ سے قائم ہوتا ہے اور اس کی تحریر میں بعض خصائص اور رجحانات، باتوں و خیالات، انداز تحریر میں ہیں۔ پروردگار اس معاملے کا نتیجہ بہت جلد ہی یہ صنعت کے حق میں یہ بہتر ہوتا ہے کہ وہ اس کے

پوری خراجِ وقت ہونے اور اس کے اچھے اثرات قبول کرنے کے بعد اپنا انفرادی راستہ تلاش کرے ورنہ محض کسی ایک روایت یا فن کار کی تقلید اس کی انفرادی خوبیوں پر پردہ ڈال کر اس کی اہمیت کو نمایاں ہونے سے روک دے گی۔ صرف ایک صورت میں یہ رجحان قابلِ قدر ہو سکتا ہے اور وہ یوں کہ نیا فن کار اپنے پیشروں سے آگے نکل جائے۔ ایسا فرد کم ہی ہوتا ہے اور پھر مختلف فن کاروں میں موضوعِ ادا سلوب کی یکسانیت قاری کے لیے مشکل پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ صرف غالب کے رنگ میں لکھ سکتے ہیں تو آپ کے نسخے بہتر ہو گا کہ یا تو اس سے آگے نکل جائے یا کوئی نیا پیرایہ اختیار کر لے۔ اقبال کی تقلید میں لکھنے والوں کی تعداد بہت بڑی ہے لیکن ان میں سے اقبال کی عظمت کی دہر سے کوئی بھی زندہ رہنے اور یاد رکھنے ہونے کے قابل نہیں ہے۔ میر کے مداح میر کے مقلدوں کی بجائے میر ہی کا مطالعہ کیوں نہ کریں۔ لیکن جو شاعر میر کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ کچھ اپنا انفرادی رنگ بھی اپنے شعروں میں بھرتا ہے وہ یقیناً کامیاب ہے۔ ناقص کاظمی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ تقلیدِ محض کی مثال شفقت کاظمی ہے۔ شفقت کو حسرت سے مشتق ہے۔ وہ خود کو غلامِ حسرت کہتا ہے اور اس کے پہلے محمود کام کا نام حسرت رکھ دیا۔ اس کا اندیشہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے بہتر ہی تخلیقی سال اور قویں محض حسرت کی تقلید میں ضائع کر دیے اور چند برس سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ ان کی شاعری میں کوئی نیا راستہ تلاش کرنے کی کوشش ہی ظاہر کر دیتا ہے۔ یہی ہے۔ معلوم نہیں شفقت کاظمی کو اس کا اس ہے کہ نہیں شفقت کاظمی ہے لیکن اس نے اپنی ذہنی و تخلیقی قوتوں کو محض تقلید کی تکرار کے اود پر غم کیا ہے۔ وہ حسرت کو مرثیہ کامل مانتا ہے۔ یہ اس کی ہند کا معاملہ ہے۔ وہ میر سے نزدیک حسرت کی شاعری میں کوئی ایسی بات مدحی جس کی تقلید کی جائے۔ مرید مرثیہ کامل میں اپنی ذات کو مدغم کر دیا ہے اپنی معراج لکھتا ہے لیکن ادب میں اس ہند کے انفرادیت کی موت کہا جائے گا۔ اور انفرادیت وہ ہنسنے ہے جس کے بغیر فنکار چشمہ آبِ حیات کا سراغ نہیں دے سکتا۔

مجھے یہاں نامور عالمی کی تقلید میرے بار جو اپنی انفرادیت کو ملحوظ نہ رکھنے دینے کی ادبیت
 آتی ہے وہ دل شہتہ کا نامی کی تحقیقی قوتوں کے منہاج کا یہ بعد صدمہ ہے۔ — میرزا
 ادیب زبانی اگر صحرانورد کے دو زبان "دالامہ" و "مستند" اختیار کئے دیکھتا تو کچھ ادب میں اُسے کوئی
 جند مقام نہ مل سکتا۔ صحرانورد کے پانچ دو زبان پر یہ کبریٰ طبیعت اس لئے شک جاتی ہے کہ
 ان میں ایک ثابت کا زہر پھیل چکا ہے۔ صحرانورد کے خطوط کے قریب بعد میرزا جند ہے کی شدت اور
 اصلاح کے جوئی کی فراوانی نے زیر اثر فنی طور پر تھلا رہا پر کا مرنی ہو گیا تھا لیکن وہ بہت جلد
 سنبھل گیا اور روایت سے رشتہ قائم رکھتے ہوئے اس نے اپنا نیا اند بھیج راستہ ڈھونڈ لیا
 چنانچہ اس کے ہدیہ انشائوں کے موضوعات ہیں کہ ایک ختم مشرک موجود ہے تاہم زندگی
 کی رنگی اور تنوع کا شیعہ اس میں غور ہوتا ہے۔ اس نے ایک دکان "اور دکان تیرگی" ایسے
 افسانے بھی لکھے جو افسانے کی عام روش سے باطل ہٹ کر ہیں اور نئی روایت کا کھس ساتھ
 بھی دینا دے اسے گے بھی بڑے عاقلانہ وہ جہاں روایت سے قطع تعلق کا قافی نہیں ہے وہاں وہ
 تقلید نہیں کو بھی مکمل طور پر نہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کی داستانوں اور دکانوں میں بھی
 ایک خاص قسم کی انجی موجود ہے اور وہ کہانیاں محض روایتی نہیں ہیں۔ نئے اسلوب، نئے
 آہنگ، نئی نگاہیں برابر جاری ہے۔ اسی لئے اب وہ ڈرامے لکھ رہا ہے۔ وہ روشنی بھیلانا چاہتا
 ہے۔ وہ چراغ افی کر دیکھنے کے حق میں نہیں ہے بلکہ اُسے برقی قہقہے کی سی قوت دینے کا آہنہ
 ہے کہ وہ روایت نہیں بلکہ اس کی نیا ت ہے۔

کئی مصنف پروانہ ہونے والے اثرات کا تعویج کرتے وقت بڑی احتیاط کی ضرورت
 ہوتی ہے۔ بار بار ایسا بھی ہوا ہے کہ ہم نے بعض مصنفین کے وہ نمائش برائی کے اپنے قہقہے
 مصنفوں سے منسوب کر دیئے ہیں جنہوں نے انہیں کبھی متاثر نہیں کیا ہوتا۔ پھر اسے چراغ
 ضرور جلتا ہے لیکن بعض چراغ خود بخود آواز دہشت بھی دے سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ نئے مصنف
 کی ہر غلطی کا سرچشمہ کسی پیش رو یا ہم عصر میں تلاش کیا جائے۔ فی کار خود بھی کی ذاتی غریبوں کا تک

ہوتا ہے جن کے لئے وہ کسی کام پر ہونے مفت نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی درست ہے کہ فی کار پر اس کے مطالعے کا اثر مفرد ہوتا ہے ایوں ہم میرزا پر فاروقی ہونے والے اثرات کی بھی ایک سنگ میل قرار دے کر سکتے ہیں۔ محرفانہ کے خطوط اور دواخان میں ہمدردی اور مرقی دواخیت اور محاب اختیار علی کے مضافات کی فضا کی پراسراریت و خوف انگیزی کا اثر غرا آتا ہے۔ لیکن میں ان مضافات کو جدید اور محاب تک محدود نہیں دیکھتا۔ بالخصوص محاب کی شخصیت اور فضا میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے کوئی پختہ فکر فضا کوئی مستقل اثر لے سکے۔ میرزا نے محاب کا مطالعہ اور ادنیٰ عمر میں کیا۔ اس عمر میں خوف اور اسرار کی کہانیاں پڑھتے ہوئے ذہن کے لئے بہت مسالمانی کشش لینے اندر رکھتی ہیں۔ محض اس دہرے میرزا بھی تصور آتا ہے ہوا دیکھیں یہ اثرات جلد والی ہو گئے۔ میرزا کی داستانوں میں جو تعبیر اور اسرار کی فضا ہے اس کا اصل سرچشمہ اود کا داستانہ ادب ہے جس کا یہ میرزا نے گرامر مطالعہ کیا ہے۔ محاب سے میرزا کو سوائے اس تحریک کے کوئی بھی ایسی چیز ملتی باقی ہیں کچھ نہیں ملے۔ سب سے بڑی چیز وہ کامی شعور ہے جس سے محرفانہ کے چند خطوط کے علاوہ اس کا کوئی بھی فضا پارہ جاری نہیں اور جس کا محاب کے ذہن میں نہیں ہوا۔ علاوہ ان میرزا کی فضا ترقی اور اسلوب میں بھی محاب کا اثر کوئی محسوس ہے اور دوسرا اثر اگر محاب ایڈگرائڈ کی طرح ہوتی تو یقیناً وہ دوسروں کو متاثر کرتی۔

ابتدائی دور میں میرزا چند مغربی مصنفین سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ رابنڈرناتھ ٹیگور، مصنف کا شیر اور دواخان کی اردو نگ کے اثرات نمایاں ہیں۔ محرفانہ کے خطوط اور دواخان کی فضا میں ان سب کا اثر محسوس ہے اور بعض اثرات کا تعبیر قلم سے فیض کے ساتھ کیا جاسکتا ہے مثلاً "مکہ" کا ماخذ رابنڈرناتھ ٹیگور ہے اور "مکہ" کا "شیر" اردو نگ کا اثر زیادہ تر عمومی نوعیت کا ہے۔ ان تینوں مصنفوں کی تخلیقات بھی اس نوع سے تعلق رکھتی ہیں جو محرفانہ کے سب سے بڑی کامی کے تخیل کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ ان کہانیوں میں کشش کے ظاہری مسالمانہ بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں اور نوجوانوں کا اس سے متاثر ہونا سحرانی کی بات نہیں۔ اس عمر میں داستانوں اور

اساطیع جہنماں ابدی صداقتوں کا شعور نہیں ہوتا پھر بھی یہ دلکش ہوتی ہیں۔ جوں وں مصنفہ کا نکل
کی حالت برصغیر ہے اس کا مغربی راستہ واضح ہوتا جا رہا ہے۔ میرزا کا محورِ خود کے خطوط اور دواں
اور دیندے گوندہ دور اسلوب کی تلاش کا دور ہے ابھی بسے وہ آہنگ نہیں ملے جو اس کا چاہیے
اور جس میں کے مزاج سے پوری سزا بقت رکھتا ہے۔ اسی لئے اس کے اسلوب میں بار بار تکرار کی جاتی ہے
میرزا پر غشی پریم چھ کے اثبات زیادہ صحت مند نہ ہیں اور ذرا دیر سے ہم ہر ہستے میرزا
پریم چھ کے ہاں بجا اصلاح کردہ اتنی جہت پر ہمیشہ کارفرما رہا وہ میرزا آفریقہ کے فن کا بھی ایک متعلق
محسوس کیا۔ پریم چھ نہ ہیں نہایت اچھے افسانے دیتے ہیں لیکن وہ جدید افسانے کے ابتدائی
دور سے تعلق رکھتا ہے اس کے بعد افسانے نے بہت ترقی کی ہے اور یہ گفت پریم چھ پر کرنی نہیں
ہیں۔ تاہم میرزا کے جدید افسانوں میں موضوع اور فن کی جو متعلق ہم ابھی ملتی ہے وہ پریم چھ کے ہاں موجود
تھی۔ اس میں ابھی اس کا وقت ہی نہ آیا تھا۔ میرزا فن کو بحیثیت فن کے بھی اہم سمجھتا ہے اور اسے نظرِ عام کی
تعمیر کا ایک ذریعہ بھی مانتا ہے اسی لئے اس کے فن یا فن میں جہاں فنی کمال موجود ہے وہاں کسی کیس کی نظر
سے عاجز ہے اور زندگی کی ترقی اور بہتری کی آمد بھی کا فرائض کرتی ہے۔ یوں پریم چھ کا اثر دیکھنا سنا
کئے میں یہ بات اور عجیب وغریب کے اثر سے کہیں زبان مضبوط ہوا ہے۔ جدید افسانے میں میرزا نے پریم چھ
کے طرزِ لہجہ ہاں کی ترقی پسند تحریک اور جدید مغربی مصنفین سے بہت گہرا اثر لیا ہے۔ انگریزی ادب کا ہر
ادب پر برہم راست اور بہت گہرا اثر ہے اور یہی جدید ادبی تحقیقی روایات کے رشتے مغربی باقیہ
ادب سے جاملتے ہیں اور وہ افسانے میں جو کچھ میرزا نے کیا اور جو کچھ ترقی پسند افکاروں نے کیا اس کی تحقیق
میں اگرچہ کئی حالات سے بڑا عزم ہے جس میں تاہم مغربی ادب کے روز افزوں ماحول کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔
۱۔ دنیاداری کے اثر کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ اب ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ انگریزی کے ذریعے ہم تک پہنچی
رہا ہے۔ ۲۔ ادب سے میرزا کو افسانے کی فنی ساخت سے آشنا کیا ہے اسے نئے سانچے سے لکھیں
اور اس کے دہار تخلیق کو کھرا رہنے کے لئے انفرادی اسلوب کی زمین عطا کی ہے۔

ملکہ مصر

مختم دوست

آج تمہارے دُور افتادہ صحرا خند و دوست کو، تمہاری شورش انفرادیت کے دلچسپ منظر کو جھوٹے ہنسنے پر سے کین سال گزر چکے ہیں۔ ان میں ہر سوس میں ایک لاکھ ہیں نے بیت انٹر سمراؤں، ہولناک ہماروں، سچی اور ریت کے اسبب قوتوں، گنجان اور بلند فتنوں کے علاوہ شادنا دہی کوئی چیز دیکھی ہے۔ اب مجھے قدرت کے ان لرزہ خیز منظر سے کت کسی ہر گئی ہے اور جیسے جیسے میرے قدم اگے بڑھتے جاتے ہیں۔ مے سے مے حیرت انگیز واقعات سنے لگتے جاتے ہیں، دوست! میں ایک ایسی دفا وین رومانیت انگیز دنیا میں سانس لے رہا ہوں۔ بس کی دلچسپیاں تمہارے تصویات سے بھی بالا تر ہیں!

صبح جب میری آنکھ کھلتی ہے تو کتاب کی شایع اولیٰا میرے لئے ایک رومانہ تانا لپٹنے کے غرض زریں میں سے راجاتی ہے اور جب دلہ بیت جاتا ہے قورات کی تاریکی عجیب و غریب پراسرار واقعات کی دنیا دامن میں لئے نمودار ہو جاتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ ایک ضخیم کتاب ہے جس کے ہر صفحے پر یہ شمار رومان بکھرے پڑے ہیں۔ میری نظروں سے گزرنے کی مانند جو بچی تھی کارس جو منہ ہے۔ اور اس پر بھی اس کی طبیعت میر نہیں ہوتی۔ مے مے کے دما دمن کو پڑھ رہی ہیں۔

تم میرے بھائیوں کو میرے انسانوں کو کتنی دلچسپی سے پڑھتے ہو یہ میں نہیں جانتا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ میرا ہر ایک انسان تمہارے دلچسپی سے ہی نثرات طاری کرتا ہو گا۔ جو اب تک میرے دل پر راسخ ہیں۔ اور معلوم نہیں کہ تک مرسم رہیں گے۔

چند دن سے میں اپنے بھائیوں کی شہرہ ریزی سے رنج و غم کے ساتھ، قدرت کی دلاویز فرنگیوں میں گھرا ہوا ہوں۔ اور یہاں اتنی دلچسپی محسوس کر رہا ہوں کہ اس کے عوض شہر کی زندگی کا وہاں بھی ہوں۔ تم میرے اس بھائی کو محض شاعرانہ مبالغہ سمجھو گے۔ مگر دوست! دنیا کی ہر نئی چیز انسان کے دلچسپی کا سامنا کرتی ہے۔ مبالغہ ہی ہوتی ہے۔ کاش تم میری مسرتوں کا اندازہ کر لو۔

آج میں تمہارے سامنے ایک ایسا داستان پیش کر رہا ہوں جو میرے پچھلے دو ماہوں سے بہرہ مند رہتا رہا ہے۔ دلاویز ہے۔ میں اسے خود کئی بار پڑھ چکا ہوں اور ہر بار اسے پتلے سے زیادہ دلچسپ محسوس کیا ہے۔ تم بھی اسے بہت پسند کر لو گے:

آج سے چھ دن پیشتر نصف دہائی کے سبب آفتاب نصف النہار نہایت تیزی سے چمک رہا تھا اور اس کی گرم شعاعوں کا جہاں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ میں اور آغا بہرام ایک درخت کے نیچے بیٹھا رہے تھے۔ ایک ایک فضا تو ریشم کا جھومکا تھا کہ آسمان کے نیچے تاریک و کثیف بادلوں کی صورت میں منڈلا رہے تھے۔ پچھلے دنوں کے برون کے ٹکڑے کی طرح مٹی کے بڑے بڑے ٹکڑے، تیز رفتور جھونکوں میں تھیلے جیسے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں اجسام خدیش کے ٹکڑے دوڑ رہے ہیں اور انہیں قریب قریب کا شائبہ ہو جانے کی۔ باوجود محسوس کے تعبیر سے درختوں سے ٹکرا کر اس طرح ٹھنڈ کر رہے تھے۔ گریبا بے شمار اندر سے ایک تاریک کنویں میں گر چکے ہیں۔ اور اپنی جان کے خوف سے بے اختیار سرخ پکار رہے ہیں۔ جس وقت

کے نیچے ہم کھڑے تھے۔ اس کے پاس ہی ایک قافہ ہم محلات اس غار میں چلے گئے۔
 صحرائیں جب بالو کو مسمیٰ پہنچتی ہے تو ہم کسی محفوظ جگہ چھپ جاتے ہیں۔ کیونکہ باہر موسم کے
 طاقت اور جھونکوں کے سامنے کھڑے ہونا یقیناً موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ یہ
 غار ہمارے لئے نہایت اچھی جگہ ہے۔ پناہ ثابت ہو گا اور گھنٹہ ہم وہیں بیٹھ سکتے ہیں۔
 جب میں نے باہر نکل کر دیکھا کہ یہ غار تو انہیں ختم کیا ہے۔ تو اپنے رفیقِ محرم کو لگے چلنے
 کے لئے آواز دی۔ مگر میں نے مجھے نہ بولایا۔ آغا ہرام کے پاس ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا۔
 یہ صاحب بھی ہماری طرح وہیں کھڑے تھے۔ آغا ہرام نے کہا۔

”سب کو بھی سیاحت کا شوق ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

غار کے شکاف میں سے اترتے ہوئے اس کے گرد اگودا ہے۔ پر پڑ رہی تھی۔ اور اس کی
 صورت بہت خوفناک دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے گھوڑے پر ہم دونوں کو لکھا۔ اور باہر نکلنے
 کے لئے کہا۔ ہم فیصلہ کر لیا۔ آغا ہرام نے کہا۔ اب افسانوں پر تکیہ نہ کریں۔ سورج چمک رہا تھا۔ ہم
 اسی وقت کے نیچے بیٹھ گئے۔

غالباً تم سیاح ہو؟ اس بوڑھے نے ہمارے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں! آغا ہرام نے جواب دیا۔ ہم صحرائوں میں اندر آپ بھی غالباً اسی جگہ ہیں

عیناً ہیں؟“

میں بہت صحرائوں کی کھچا ہوں۔ اس نے شہنشاہی آواز بھرتے ہوئے کہا۔ آپ چند منٹ پہلے
 اس صحرائے رہتا تھا۔ دن بھر جنگل میں گھومتا رہتا ہوں۔ شکار کرتا ہوں۔ اور رات کے وقت
 اس غار میں سوتا ہوں۔ میں بھی ایک دن جوان تھا اور یہ غار کی طرح گھبراہٹ تھا۔ مگر اب
 میری زندگی کا ہر راز مجھ دیا ہے۔ ٹانگوں میں زبانی چلنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

آدمی واقعی خوش قسمت ہستے ہیں؟

نواب تھما اس غار میں بیٹھے ہیں؟ میں نے پہچا

ہاں! کیا ہرج ہے؟ اس نے بے پروائی سے جواب دیا

یہ میں نے اس سے پہچا کہ بڑھاپے میں ایک ہدم کی سخت ضرورت ہوتی ہے

ہدم؟ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا میرے کئی ہدم ہیں۔

یہ شخص چند گھنٹوں کے بعد ہم سے بے تکلفانہ گفتگو کرنے لگا۔ مگر میں دیکھ رہا تھا کہ اس

کی حالت کدو بہ طور بگڑتی جا رہی تھی۔ اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ چند گھنٹوں کا زمانہ ہے۔

تو اس نے غار میں سے ایک سنگ مرمر کا ڈبہ لاکر میرے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ میں نے اسے

کھولا۔ اس میں کاغذات کا ایک چلند تھا۔

یہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

اُن..... اس نے کمزور خمیہ آواز میں کہنا شروع کیا: اہ اوراق میں تین ہستیوں

کی سرگزشتیں درج ہیں جنہوں نے محبت کی، بر محبت کی کشش اور جنہوں نے آخر محبت ہی

کے ہاتھوں..... موت کا شریعت پایا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو چپکنے لگے۔ اور اس نے سلسلہ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا

اُن میں سے ایک تو مجھ کو کھائی ملی، اور میں نے پھر اُسے اپنے الفاظ میں کھلا۔ یہ

سرگزشت مصر کی عہد کی ہے اور باقی دوسرے شتوں کو میں نے دوسروں کی زبانی سنا اور پھر

انہیں کھل لیا..... یہاں میری زندگی کی تنہا دلچسپی انہی انسانوں سے وابستہ تھی اب

چونکہ موت کے روانے پر پہنچ..... گیا ہوں، اس لئے یہ اوراق..... تمہارے

سپر دکر آہوں۔ تم انہیں بے حد دلچسپ پاؤ گے..... اکثر چانوں پر بیٹھ کر ان انسانوں

کو بڑھنے سے مجھے بے درگفت حاصل ہوتا تھا..... افسوس وہ زمانہ گزر گیا!

ایک دن اور زندہ رہا کہ یہ ٹیک دل ہڑتاد دیا سے رخصت ہو گیا۔ میں نے خاندان کو پرستار یہ کہتے دلچسپ ہیں؟ کہتے دلہویز؟ اس کا انداز تم خود لگا سکو گے۔

آج پیارے دوست! میں پانچ سو سال یعنی لاکھ مصر تمہاری زبان میں لکھ کر تمہیں بھیج رہا ہوں۔ میں نے اس کے پیڑ پر بیان کرنا سب تک بدل دیا ہے۔ مگر تمہاری یہ داستان آگلیٹی لاکھ مصر کی ہدم و انیس اور محل کی سب سے بڑی خاصگی تھی ہے۔ آگلیٹی نے یہ واقعات معبود رح کے ایک محافظ کو سنائے۔ اس نے یہ واقعات کسی اور کو سنائے۔ آخر کار ایک عورت نے انہیں لکھ دیا اور اس طرح یہ داستان محفوظ رہی۔ یہ چیزیں مجھے مرحوم بوڑھے نے بتائی تھیں۔ میں عنقریب دوسرے رومان بھی تمہاری خدمت میں بھیجوں گا۔

تم سے ملنے، تم سے باتیں کرنے کا بے حد خواہش مند تمہارا دور افتادہ دوست!

”محر افورد“

(۱)

آغاز داستان!

اے معبود رح کے محافظ! چونکہ تم میرے عزیز ہو اور میرے دل میں تمہاری عزت ہے۔ اس لئے میں تم سے درخواست کروں گا کہ تمہاری پابندی میں تمہاری آمد کے مطابق تمہیں وہ تمام تحیر افزہ واقعات سنائیں گی۔ جو چند سال سے مجھے پیش آرہے ہیں۔!

”تم جانتے ہو مصر دیہات میں ہمیشہ صداوت رہی ہے۔ فرعون و رعیں دوم کے زمانہ حکومت میں مصری سپاہیوں نے یونان پر حملہ کیا اور بے شمار یونانیوں کو اس میں غارتیوں اور

بچے بھی شامل تھے۔ قیدی بنا کر مصر میں لے آئے اور ان میں سے بیشتر تعداد کو سخت بیماری سے قتل کر ڈالا۔ بہت سے یونانی چھپ گئے اور اس طرح ان کی جان بچ گئی۔ اسی اثنا میں فرعون فوت ہو گیا۔ اس کی نعش محل سمیط کے لئے محل کے آخری زمانے میں پہنچی گئی۔ رات کو میں یہ دیکھنے کے لئے کہ زمانے کے ارد گرد خفیہ راستوں پر پہرہ دار اپنے فرعون کا انعام دے رہے ہیں۔ یا نہیں زمانے کی عزت ہانے لگی۔ کئی پہرہ دار سو چکے تھے۔ میں نے خاموشی کے ساتھ زمانے کا دروازہ کھولا۔ صبح سے پہلے میری نظر فرعون کے تابوت پر پڑی۔ تابوت کے ارد گرد سیاہ چراغ جل رہے تھے۔ حور و عنبر کی خوشبو سے کمرے کی فضا میں ملبہک رہی تھیں۔ فرعون کا سر تابوت سے باہر نظر آ رہا تھا۔ میں نے جھک کر اس کے سر کو دیکھا۔ اور عقیدت مندانہ جذبات سے میرا سینہ لبریز ہو گیا۔ میں نعش پر جھٹک گئی۔ یہ ایک میرے کانوں میں دھم سی آواز آئی۔ اس بات سے مجھے سخت حیرت ہوئی۔ کیونکہ وہاں داخل ہونے کی کوئی برأت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے کے آخری کونے میں دو سائے نظر آ رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ چل کر ان کے پاس پہنچی۔ اس وقت جو منظر میری نگاہوں نے دیکھا، اسے میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔

دھم دھننی تہا جیسے ایک عورت اور ایک لڑکی نظر آئی۔ دیوار سے لگ کر ان کے پاس کھڑی ہو گئی کہ دشمنی کم ہو جائے کی وجہ سے میں ان کے چہروں کو بخوبی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ تاہم میں محسوس کرتی تھی کہ وہ یونانی عورتیں ہیں۔ ان کے چہروں سے انتہائی مایوسی شگ ہو رہی تھی۔ ادھر عطر کی عورت نے جوڑی کی کی ماں معلوم ہوتی تھی۔ پہنے ہاتھیں رنگ مرمر کی ایک چھوٹی سی صندوقچی پکڑی ہوئی تھی دونوں خاموش کھڑی تھیں۔ اس وقت میرے سامنے عجیب پر اسرار منظر تھا۔ کمرے میں عزت انگیز عزت اور خاموشی چھائی ہوئی

تھی۔ اُن کے سانسوں کی مدھم آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ جہاں ہیں کچھ ہی تھی وہاں کاہل تاریکی تھی۔ اس لئے سو، مجھے بالکل نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ مگر ان کے ارد گرد جھمکنی چلی ہوئی تھی۔ فرعون کے تابوت کی طرف اُن کی پشت تھی۔ اور حیرت مرعورت نے بس آہ بھری اور لڑکی کے کندھے پر دایاں ہاتھ رکھ کر مغموم آواز میں کہنے لگی۔

یو رہا! میری بچٹی! اگر ہم کچھ دیر اور رہیں، ہے تو مصری جلاوہیں قتل کر ڈالیں گے! تو بھاگ جا میں ماں! لڑکی نے جھولے پر سے کہا۔

کہاں بھاگ جائیں..... جہاں جائیں گے وہیں مصری جلاوہیں پکڑ لیں گے۔
اولیٰ محل سے نکلنا ہی محال ہے وہ مضطرب آئیں گے۔ او..... خدا سے زیوس کی اُن پر امنت ہو!

میں کچھ گئی کہ یہ یونانی عورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک ماں ہے اور دوسری لڑکی۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے زناں بھی چوٹی ہیں۔ خدا برہمنے سے پیشتر میں نے ان کی گفتگو کو مستحسن سمجھا لیا۔

تو اب کیا کرنا چاہیے ماں! لڑکی نے پوچھا

کچھ بھی نہیں..... مصری جلاوہ بھی اگر میں قتل کر ڈالیں گے۔

نہیں ماں! لڑکی خوف سے کانپنے لگی۔ اس پر ماں نے اس کے بازوؤں کو کھڑکیا۔

خدا موٹا! ماں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

زہر کھا کر مرنا ذلیل مصریوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے ہزار درجہ بہتر ہے مٹی!

تجھے موت سے ڈرنا ہے ماں!

مگر ہم کسی حالت میں بھی موت سے نہیں ڈرتے، خدا سے زیوس کی قسم! ہم مصریوں

میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اب خوف بہت حد تک اس کے دل سے نکل چکا تھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے پیار سے پوچھا۔

”..... یوروپا!“

یوروپا میری بیٹی یوروپا!“

یوروپا نے آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا ایسا پیارا چہرہ میں نے تمام مصر میں نہیں دیکھا تھا۔

”تو میرے پاس رہے گی، میری بیٹی یوروپا!“

”مصری ہمارے مجھے قتل کر ڈالیں گے۔“

”نہیں بیٹی، ایسا نہیں ہوگا، میرے کوئی جی نہیں ہے میں تجھے اپنی بیٹی بنا لوں گی۔“

”مجھے مصریوں سے ڈرنا ہے، اور یہ کہتے ہوئے وہ کا پھنے گی۔“

”مصری بہت مہربان سمجھتے ہیں، یوروپا! تو میرے پاس نہایت آرام سے رہے گی یہی

تجھے آرام سے ملے گی میں رکھوں گی محل کی تمام خدائیں تیری خدمت کریں گی۔“

”مصری بے رحم نہیں ہوتے؟“

”بالکل نہیں۔ جلد وہ تیرے جیسی پیاری لڑکی کے ساتھ کیونکر رہ رہی کر سکتے ہیں؟“

”ایسا نہیں ہوگا بیٹی!“

”میرے ماں سے تو کہا تھا کہ وہ مجھے قتل کر ڈالیں گے!“

”تیری ماں کو سخت غلط فہمی ہوئی تھی اس نے تیرے دل میں بھی مصریوں کی حدت سے نفرت

پیدا کر رکھی ہے جلد اب چلیں۔“

”کہاں؟“

تیرے کمرے میں! ڈر و دستدار کچھ میں تمہاری ماں ہیں؟

ایسا بچہ کچھ نہیں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آہستہ آہستہ ہم باہر نکل آئے محل میں خاموشی چھا گئی تھی وہ تمام راہ و رقی رہی۔ ڈر ڈر کر بندے سے پیشی نہی میرا بٹا چند دن سے دہر گیا ہوا تھا۔ اس نے کمرے میں کوئی بھی نہ تھا میں یوں پکا کا ہاتھ پکڑے کرے میں داخل ہوئی ہے ہنگام پر بڑا دینا اور آپا کے پہلو میں بیٹھ کر اُسے تسکین دینے لگی۔

(۲)

کاہن اعظم کی پیشین گوئی!

میرے کوئی بیٹا نہیں تھی اس نے میں تو دو بچہ کو اپنی تحقیقی بیٹی سمجھنے لگی۔ بڑا بچہ کچھ واقعات کو بہت دور تک فراموش کر چکی تھی۔ مگر ابھی تک وہ وہی سہمی ہوئی، خوفزدہ، غمگین صورت رکھتی تھی، جسے میں نے تھانے میں دیکھا تھا۔

میں نے اسے محل کے صحن میں ایک مکان لے دیا تھا جس میں وہ وہی تھی اور میں بھی زیادہ وقت وہیں گزارتی تھی۔ باوجودیکہ اُسے وہاں رہتے ہوئے ایک سال گزر چکا تھا۔ وہ مہرلوں سے بہت خوفزدہ رہتی تھی۔ چونکہ مصباح میں گئے ہوئے تھے عرصہ گزشتہ تھا۔ اس نے جب ایک دن میں تھوڑا پائے پاس پہنچی اور خدا کے روح کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا ارادہ کر لیا اور گورڈ پا کو بھی ساتھ لے جانا چاہا۔ وہ بہت ڈری اور خوفزدہ لیجے میں کہنے لگی۔

”جیسے بہت خوف محسوس ہوتا ہے، ماں!“

”خوف؟ ابھی تک تمہیں ہر چیز سے خوف محسوس ہوتا ہے؟“

”نصیری بہت خوفزدہ ہوتے ہیں!“

فضائل میں خوشبو کی لہریں تیر رہی تھیں۔ گیت ہماری تھا۔۔۔!

”قویہ دار ہو۔ اے نیکو کار۔ اے خدا کے رعب! اے آسمان کے مومن! کنوڑ
کے مالک! اے روشنی دینے والے خداوند! اے خدا کے رعب! تو بڑا سہارا
کی سیر کرنے والا ہے۔ قیر سے دشمن تھا ہوں اے خدا کے رعب! فرعون کی ٹکر
درا کر! اس کے پیٹ کو روٹی اور اس کے حق کو پانی نہ بچا۔ اس کے باپوں
کے واسطے طہر عایت کر۔ تمام راہیں تیری روشنی سے معمور رہیں! تو وہ خدا
ذات ہے۔ جس کے پردوں سے بھلی پیدا ہوئی۔ تو وہ شیر بہر ہے، جس کی
گرج سے دشمن کانپ جاتے ہیں۔ تو وہ قفس ہے، جو مختلف رنگ لکھا
ہے! آسودہ ہو اے خداوندوں کے باپوں کے باپ! اے موجودات پیدا
کرنے والے، اے سب چیزوں کے بنانے والے۔ اے عبادوں کے رب! اور“

اب آواز درگ گئی۔ تمام کاہن اور کاتبان پہلی گئیں۔ کاہن اعظم ابھی تک جھٹکائے
خدا کے رعب کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے یورودیا کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھی۔ کاہن اعظم
نے سراسیمہ اور مڑ کر بھاری طرف دیکھا۔

خدا کے رعب تم پر رحم کرے! گھٹلی!۔ اس نے کہا

خدا کے رعب کی عظمت بہر جو۔ یہ میری بیٹی ہے۔ میں نے یورودیا کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے کہا اس کے متعلق پیشین گوئی کیجئے!

اُس سے کھڑک کر یورودیا کی تربت دیکھ کر یورودیا نے خوفزدہ ہو کر دونوں ہاتھوں سے
اپنا بھروسہ چھپا لیا۔ چند لمحے خاموشی جاری رہی۔ کاہن اعظم سر کے بن خدا کے رعب کے سامنے
گہر پڑا۔ اور اس کی عظمت کا گیت جس نے لگا ایک طرف سے گر جتی ہوئی آواز پیدا

ہوئی میں سمجھتے ہیں گریہ کر رہی۔ اور جوب اٹھو۔ تو میں نے دیکھا کہ یوسف ابھی بیدار ہے۔
 بے میں نے اُسے اٹھایا۔ اب کہہ ہی اٹھم اچھا اور بان ر آواز میں کہنے لگا۔
 تھکاتے دیر کے جلاں کی قسم، اس کے سر پر تاج ہوگا۔۔۔!
 یہ سن کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔
 کہہ ہی اٹھم کہے بارہ تھا۔
 یہ سہری نہیں اور نانی لڑکی ہے۔

میں ڈوگئی کہ ابھی اٹھم پھر سمجھتے ہیں کہ بڑا۔ اور وہاں تھکے پہنچ گئی اچانک میری
 نظریات کسے پر پڑی۔ وہی بڑے صاحبے ہم نے معبد میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ انجلیں
 پھاڑ پھاڑ کر دیر دیر کی طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔ میں نے یورو پا کا ہاند پکڑا اور ہوجو
 سے بچنے لگے مکان پر پہنچ کر میں اس واقعہ پر غور کرنے لگی۔
 کتنا ہمارا اور کتنا عجیب و غریب واقعہ تھا؟

یورو پا کے سر پر تاج ہو گا۔ یہ بات وہ کہ میرے دل میں ابھرائی کیا ایسا ہو سکتا ہے؟
 انجلی خیالات کو دماغ میں لے سوائی۔ خواب میں دیکھا کہ یورو پا بالکل بدل
 گئی ہے۔ اس کے سر پر مذہبیت نہایت پکڑا ہوا تاج نظر آ رہا ہے۔ وہ سنہری کرسی پر
 بیٹھی ہے۔ فرعون آتا ہے اور اسے آغوش میں لے جاتا ہے۔ نیلک میری آنکھ کھل گئی۔
 یورو پا میرے چلو میں کود رہی تھی۔ سوتے میں اس کو پتہ نہایت خوب صورت
 دکھائی دے رہا تھا۔

نہاں! اُس نے اُنکو کھول کر بچ دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ خوفناک پہننے لگا۔
 کون تھا جس نے معبد میں غور کر بچنے دیکھا تھا؟

”وہ خوفناک بوڑھا — بہ کوئی ہوگا ہیں کیا؟“

”خدا! روح کا گھبراہٹ ہوگا! یہ کہ کردہ اٹھ بیٹھی۔ اور میں طرح طرح کی پلچسپ باتوں سے اس کا دل ہلنے لگی۔“

(۳)

ایک پراسرار واقعہ!

مذکورہ بالا واقعہ کے بعد پورہ دیا پچھلے سے بھی زیادہ گم سم، خاموش اور اندرونی پسینہ لگی۔ اس رات کے واقعہ کو جب میں سویتی۔ ایک دم سم سا جھڑپت میرے دل کی گھبراہٹوں میں پیدا ہو جاتا۔ میں نے کئی بار اس موضوع پر پورہ دیا سے گفتگو کرنا چاہی مگر وہ ہر بار ایک لفظ نکالے بغیر، ایسا دلفریبوں سے مجھے دیکھ کر خاموش ہو جاتی کہ اپنے افسانہ کی پختہ نہیں ہوئی کہ، اس کی ستم فرمائی بکھیتی تھی۔

”خوبہ حکومت پر فرعون (منقار) بیٹھ چکا تھا وہ ایک خوش رو، وجہ۔ فوجیوں تھا نہ صرف وجہ بلکہ یکایک طینت بھی تھا۔“

اس شام، خاموشی کا ذکر کرنے لگی ہوں۔ پورہ ہاقد سے جانش تھی۔ وہ مکان کے نیچے باغ میں نعلی رہی تھی۔ میں کمرے کی کھڑکی سے دُور افق کو جہاں سنہری بادل لہرا رہے تھے، ادیکہ رہی تھی۔ مکان سے دھوئیں کے کثیف بادل اٹھ اٹھ کر چھوٹے چھوٹے دھندلوں میں تقسیم ہو کر فضا سے بسیط میں آہستہ آہستہ غائب ہو رہے تھے۔ بعد رات سے گھنٹیوں اور گیتوں کی آوازیں آکر بھی تقسیم۔ میں انی منظر کو دیکھ رہی تھی کہ میری نگاہوں نے دُور اسی خوفناک بوڑھے کو دیکھا۔ جسے معبدِ ریح میں، میں اور پورہ دیا

دوبارہ دیکھ چکی تھیں۔ وہ ایک قوس پر کھڑا کٹکی باندھ کر ہمارے مکان کی دیواروں کو دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں کے لئے میرے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے۔ مگر جب میں نے اپنی حیثیت اور مرتبے پر غور کیا تو تمام خیالات دور ہو گئے۔

یہ وہاں بیٹھے پھولوں سے لدی ہوئی ڈالینوں کو ہاتھی، پھولوں کو توڑتی ہوئی سن رہی تھی۔ تنکاوٹ محسوس کر کے میں کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر تو میرا دماغ مختلف خیالات کی کشمکش میں گرفتار رہا تاں کہ میں نے اپنے عجیب و غریب، تاثر آہستہ سے بھیج کی پیشین گوئی میرے کانوں میں گونج رہی تھی پھر آہستہ آہستہ میرے جسمانی اعضاء اور دماغی اعضاء نے جسم کو قید کی گود کے حوالے کر دیا۔ ایک سخت میری آنکھ کھل گئی۔ پردہ کی تیرہ روشنی میری آنکھوں میں ٹک رہی تھی۔

میں آنکھ کھلی میرا دل یوں کڑھتا چھوڑ کر، خود سو جانے پر خود کو مفلون کرنے لگا تھا۔ اُسے مجھے محفوظ رکھے بغیر پیاری لڑکی ہے۔ یہ الفاظ میرے بون سے بے اختیار نکلے، اور میں نے ایک کھڑکی کے پاس کراسے آواز دی مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ دوبارہ آواز دی۔ اب کے بھی خاموشی طاری رہی۔ میں کھڑکی سے ٹک کر بیچے باغ میں، کٹی، اور اُسے دیکھ کر ٹپٹپٹا گیا۔ باغ کا کرنا کرنا چھان اور، مگر پتہ پا کیس بھی نہ تھی۔ اتنا پتہ سراسر خوف اور اتھوڑے نام زندگی میں پہلی بار پیش آیا تھا۔ اس لئے میری حیرت کی کوئی انتہاء نہ تھی۔ شاید اُسے ہی نے پہچانی لیا ہے، اور قتل کر دی گئی ہے۔ اس خیال کے رونا میں آتے ہی میرا دل غمزدہ ہونے سے بھر گیا۔ میں اسے حقیقی معنوں میں رہنمائی بھی نہ تھی۔ اور اُسے کسی صورت میں بھی خود سے جدا کرنا نہیں جانتی تھی۔ مگر میں نے اُسے تنہا چھوڑا ہی کیوں؟ یہ سوال بار بار میرے دل میں پیدا ہوتا تھا۔ اگر میں اُسے اس طرح بچھوڑتی تو یہ ہر لحاظ سے واقعہ کبھی بھی

دونما نہ ہوتا۔ کتنی ایرنک اس قسم کے خیالات میرے دماغ میں پکڑ لگاتے رہے، اور میں چھپاتی رہی۔ اسی اثنا میں بوڑھے کی شکل میری نظروں کے سامنے پھرنے لگی۔

ممکن ہے یہ حرکت اُسی کی جوت میں نے دل میں سوچا۔ آخر وہ بار بار چھپ کر نہیں کیوں دیکھت تھا؟ اور کچھ در پہلے دو۔ کھڑے ہو کر مکان کو ٹکٹنگی ہانڈھ کر دیکھنے سے اس کا کیا مقصد تھا؟

مجھے جیسے ان خیالات کا جہوم میرے دماغ میں زور پکڑتا جا رہا تھا۔ میری روح غم کے تلخ آوے سات کی زنجیروں میں گرفتار ہوتی جاتی تھی۔

آسمان پر سارے ہمک رہے تھے۔ میں باغ سے باہر نکل گئی۔ اور ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ اس وقت اپنی بے چارگی پر مجھے خود غصہ ہوا تھا۔ پہلے تو میں نے چاہا کہ محل میں جا کر اپنے بیٹے سے یہ واقعہ بیان کر دوں۔ اور اس کی مدد سے پردہ پا کو دھو دھو لوں مگر یہ مناسب خیال نہ کیا۔ آخر کار میں ایک طرف چلنے لگی۔ اور پھر دھندلے ہو کر پھر باغ میں پہنچی اور شہت ملال سے گر پڑی۔

میں لیٹی رہی اور جب اٹھی تو آسمان پر سارے اندر پڑ چکے تھے۔ کاحنوں کے گہوت فضا میں ہزار ہے تھے۔ اچانک ایک طرف سے چوہا آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں فوراً اس کے پاس پہنچی اور بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

یہ مردہ! میری بیٹی تو کہاں چلی گئی تھی؟

اس کے ہمرے پر خوف و ذہشت کے اثرات نمایاں تھے۔

تو اتنی خوفزدہ کیوں ہے؟ میں نے پھر پوچھا

تیں کس مصیبت میں پھنس گئی ہو، اماں؟

”تو کسی مصیبت میں نہیں بچس سکتی، یوروپا!“
”مجھے اُوپر لے چلو۔ اس نے کمزور و نحیف آواز میں کہا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ہم اوپر آگئے۔
میرے ساتھ ایک عجیب حادثہ پیش آیا ہے۔“ یوروپا نے کچھ دیر ٹھہر کر کہنا
شروع کیا..... اور پھر وہ ایک دم ڈگ گئی۔
”کیسا حادثہ؟“

”میں کچھ بھی نہیں بتا سکتی۔ میں اُن سے ڈرتی ہوں۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ
لے لیا ہے کہ اس حادثے کے متعلق ایک لفظ بھی کسی سے نہ کہوں۔“ وہ ذرا ٹھہری امد
پھر کہنے لگی۔ ”میں نہیں بتا سکتی ماں! آہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہوں؟“
یوروپا! میں نے پیار اور شفقت سے اُس کی گردن کے گرد ہاتھ میٹل کر دیئے
”تم مجھے اپنی ماں نہیں سمجھتی؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”وہ اس حالت میں تھا کہ وہی کوئی بات مجھ سے بخشیدہ نہیں رہی تھی؟“

”لیکن انھوں نے مجھ سے وعدہ لے لیا تھا اور میں اُن سے ڈرتی ہوں۔“

”تمہیں کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے یوروپا! مجھے تمام واقعات بتاؤ تاکہ میں تمہاری
”امین“ دور کر سکوں۔ خدائے رح کی عنایت کی قسم! جب تک تمہیرے پاس جو کوئی
بھی نہیں تکلیف پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کہو بیٹی! تمام قصہ مجھ سے کہو!“
اس پر اُس نے ڈرتے ڈرتے کہنا شروع کیا۔

”وہی خوفناک بورسا، جو ہم نے معبودِ رح میں دیکھا تھا، چمکے سے یہاں آیا میں

ڈر گئی۔ اور میرا خیال تھا کہ تم مجھے دیکھ رہی ہو۔ مگر میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ میرے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ چھپنے کے لئے کہا اور اس کے ساتھ ہی کہا میں یونانی ہوں۔ اور تم بھی یونانی، ہمیں مصری کتوں سے جان بچانی ہے۔ اس لئے میرے ساتھ چلو۔

میں اس وقت کیا کر سکتی تھی؟ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور مجھے مصریوں کے مقام کے واقعات سناتے رہے۔ چلتے چلتے ہم ایک غار سے دروازے پر پہنچ گئے۔ اس نے غار کے اندر قدم رکھا۔ میں بھی ڈرتی ڈرتی اندر داخل ہوئی۔ اندر چراغ جل رہے تھے۔ اور بے شمار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے اپنی گونیاں جھکا لیں اور بوڑھے نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہنا شروع کیا — :

بہنٹی! امدلئے زیوس تجھے اپنی شفقت میں رکھے۔ میرا نام ٹھوس ہے اور میں یونانی ہوں، انھارے وطن کا باشندہ، ایساں تجھے آدمی ہیں۔ سب یونانی ہیں۔ تو نے دیکھا کہ مصریوں نے یونانیوں پر کیا کیا مقام کسکیں انھیں کس بے دردی سے قتل کیا ہے کتنی غلامانہ طریقوں پر انھیں ہلاک کر کے، ان کے جسموں کو جنگلی جانوروں کے آگے پھینکا گیا ہے کیسے کیسے

عذاب دے دے کر ہزاروں یونانیوں کو ترسیع کیا گیا ہے، تو سب کچھ جانتی ہے۔ اور تجھے یہ سب کچھ جاننا چاہیے۔ ہم جان بچا کر یہاں پہنچے ہوئے ہیں، اور جا چتے ہیں کہ مصریوں سے اپنے مقتول بھائیوں کا بدلہ لیں گے۔ اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم اپنے ملک میں بارام پہنچ جائیں۔ تاکہ وہاں ہمارا انتقام لینے کی کوشش کریں۔۔۔۔۔ ہم مصریوں سے ضرور بدلہ لیں گے۔ کیا تو وعدہ کرتی ہے کہ اگر تجھے یہاں طاقت و عزت حاصل ہوئی تو ہماری حفاظت کرے گی اور مصریوں سے بدلہ لے گی؟ میں تو یونانی ہے۔ مصری

ہمارے دشمن ہیں!"

میں خاموش رہی۔ وہ پھر بولی۔

"میں معبودِ مع کے کاہن اعظم کی پیشین گوئی سن چکا ہوں۔ اگر وہ پیشین گوئی سچی ثابت ہوئی تو کیا تم یو تانیوں کی مدد کرو گی؟"

اب ایک سین فوجوں میرے سامنے آیا۔

"بیٹا یہ نانی فوج کا افسر تھا۔ اس کا نام 'میرون' ہے۔" محوس نے کہا۔

اس نے بھی بوڑھے کے الفاظ دہرائے۔

"ہاں میں وعدہ کرتی ہوں! میں نے مجبور ہو کر کہا

یہ سُن کر وہ ہست خوش ہوئے۔

خدا نے زیوس کی قسم کھاؤ! بوڑھے نے مشفقانہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے خدا کے زیوس کی قسم کھا کر وعدہ کیا۔ اس کے بعد بوڑھے نے میرے ہاتھ

میں سے خون کے چند قطرے نکالے اور انھیں ایک ڈیسہ میں ڈال دیا۔ پھر میرے سر

کے کچھ بال نوچ لئے اور انھیں بھی وہیں رکھ دیا۔

"یہ تمہارے وعدے کی علامت ہے۔ خدائے زیوس تجھے دیکھ کر کھیل میں مدد دے گا"

اس کے بعد بوڑھا مجھ پر ہاتھ پھیرا۔

"ہاں! یہ کیسی مصیبت ہے! تمام واقعہ بیان کرنے کے بعد اُس نے کہا

"کوئی بات نہیں بیٹا! میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا

"مگر اب کیا چوگا ماں؟"

"کچھ بھی نہیں!"

”وہ بوڑھا مجھے پھر وہاں لے جائے گا۔“

”نہیں، اب میں تجھے کبھی تہا نہ چھوڑوں گی۔“

”نکمر! وہ بے شمار آدمی تھے۔“

”اگر تم مصر کی مکہ میں جاؤ، تو ان کے ساتھ کیا کرو گی؟ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں ان تمام کو قتل کر ادوں گی۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے

اُس کا سراپہ زانو پر رکھ لیا اور وہ سو گئی۔“

(۴)

شاہی محل میں!

چند دن سے یورپا بہت بے قرار تھی۔ خوفناک و دہشت افزا واقعات نے

پے در پے رونما ہو کر اس کے دل پر بہت بُرا اثر ڈالا تھا۔ السیر سیاری اور خوب صورت

لڑکی کو خوف و ترس سے زبردستی کانپتے ہوئے دیکھ

کر میرا دل بھی بھر اٹکا تھا۔ میں اُسے آرام پہنچانے، اس کا غم غلط کرنے کے لئے اپنی محنت

سے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرتی تھی۔ راتوں کو اُسے خدا سے دعا اور ریت آئی میز کے

جلال و قوت کے واقعات سناتی، اپنی گزشتہ زندگی کے عجیب و غریب قصص سنا کر دیکھ

وہ ان میں کوئی دلچسپی محسوس نہ کرتی۔ اس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک صبح کو

جب وہ اٹھی تو اتنی بے قرار و مضطرب تھی کہ میں ڈر گئی۔

”جو بیٹہ ہو رہا! باہر چل کر سیر کریں۔“

”باہر؟ باہر ماں؟“

”کیا ہر جہ ہے بیس؟“

کچھ دیر بعد ہم نسل کے کنارے پر ٹپل رہے تھے۔ ماہو نسل کی رنگ دریاں
موجیں بار بار اٹھ کر، ہلکا سا ترقم پیدا کر کے ساحل پر بکھرے ہوئے کھڑا اور دُھند میں
غفلت جہازوں کے شکستہ ٹکڑوں، چھوٹی چھوٹی چٹانوں، ریت اور مٹی کے توبوں
سے ٹکڑا کھلا کر واپس جا رہی تھیں۔ پانی، کے سینے پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں بہت خوبصورت
دکھائی دے رہی تھیں۔ ملاحوں کے ترنم ریز گیتوں سے فضا سمیرا تھی۔ ایک طرف
نمیبیہ دریا کی بلند عمارت سر اٹھائے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ آسمان کی مشرقی دیواریں
میں خدا نے روح عظمت و جبروت کے ساتھ نمودار ہو رہا تھا۔ ہر چیز، ہند کے ہندوں
میں لپٹی ہوئی تھی میں نے پورا دبا کے چہرے کی طرف دیکھا وہ میرے پاس ایک قوسے
پر ٹھوڑی کے نیچے، تجمل رکھے انداز پر لگا ہیں گاڑھے یوں بیٹھی ہوئی تھی۔ گویا
مصر کی مکہ کسی سوچ میں غرق ہے۔ اُسے دیکھتے ہی میرے کانوں میں کاہنیاں اعظم کے
الفاظ گونجنے لگے۔ میں نے پیار سے مورپا کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونک اُٹھی۔

”آب تو کدو ش معلوم ہوتی ہے نا بیٹی!“

اس نے میری طرف نظریں اٹھائیں۔ آہ ان میں حسرت و مایوسی کر دہی لے رہی
تھی۔ اس چیز کے بارے میں نہایت خوبصورت نظر آرہی تھی۔ ایک ایک سطح آب پر
مجھے ایک ندریں بھر دیکھائی دیا۔ یہ فرعون کا بچہ تھا، خدام ساحل سے لوگوں کو کہنے لگے
”ہاں یہ کس کا بچہ ہے؟“

”فرعون کا بیٹی!“

”فرعون کا؟.....“ وہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے؟ وہ نذر و آواز میں

کہنے لگی۔

”تم ڈرتی کیوں ہو یودو پا؟ فرعون سے کیوں ڈرتی ہو؟
میں یونانی ہوں۔“

”پھر کیا ہوا، فرعون بڑا مہربان شخص ہے۔“

”وہ مجھے گرفتار تو نہیں کرے گا؟“

”کیسی بھولی بھالی باتیں کر رہی ہو۔ فرعون تو تمہیں دیکھ کر خوش ہو گا۔“

”اے، مجھے چھپا لو۔“

اب ہجرا ساحل کے پاس پہنچ گیا تھا۔ خدام نے ایک سنہری سیڑھی بحیرے سے

لگا دی۔ اور فرعون نیچے اُترنے لگا۔ وہ اس وقت نہایت وسیع اور شاندار

شخصیت معلوم ہوتا تھا۔ نیچے اُتر کر اس نے پاروں طرف نظر اٹھائی۔ یکایک اُس

کی نظریں یودو پا کے چہرے پر آکر ڈگ گئیں۔ یودو پا نے اسے ڈرتے ہوئے دیکھتے

ہوئے دیکھا۔ فرعون برابر اُسے دیکھ رہا تھا۔ یودو پا گھر کر مجھ سے چھٹ گئی۔ فرعون

نے مجھے دیکھا اور اس کے بعد خدام کے ہجوم میں داخل ہو گیا۔ یہ واقعہ اتنی جلدی

پیش آیا کہ فرعون کے جانے کے بعد بھی چند لمحے میں حیران و پریشان وہیں کھڑی رہی

پھر میں اور یودو پا اپنے مکان کی طرف چلنے لگیں۔ راستے میں نہ تو میں نے یودو پا سے

کچھ اور نہ یودو پا نے مجھ سے بات کی۔ خدوئے محبت بھری نظروں سے یودو پا کو دیکھا تھا،

میں سوچنے لگی کہ کیا کاہن اعظم کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہو گی؟

اس خیال کے آتے ہی میں یودو پا کے پاس گئی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

اس کی نظریں فرعون کے بحیرے پر پڑی تھیں جو ساحل کے پاس نظر آ رہا تھا۔ وہ پھر

میری طرف مڑی۔

”وہ فرعون ہی تھا ماں؟“ اُس نے کہا۔ اس وقت اس کے چہرے پر میں حیرت انگیز تبدیلی دیکھ رہی تھی۔

”ہاں بیٹی!“

فرعون — فرعون!!“

”کیا ہے بیٹی؟“

اس نے صرف مجھے دیکھا، اور خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد تمام دن وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اس نے بیشتر وقت کھڑکی کے پاس گزارا۔ اور بار بار مجھ سے فرعون کے متعلق دریافت کیا۔ رات بھی بڑی گزرتی۔ صبح کے وقت میں نے خود کو فرعون کے خاص خادموں کے رختے میں پایا۔ وہ مجھے فرعون کے حضور میں لے گئے۔ جس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

”وہ لڑکی کون ہے جو کل تمہارے ساتھ تھی؟“

”وہ.....“ مجھ سے آگے نہ بولا گیا

”اُسے جلد لاؤ!“ یہ اس کا دوسرا حکم تھا اس وقت میں عجیب مصیبت میں گرفتار تھی۔ اور جب مکان میں پہنچ کر وہاں سے کہا۔ ”فرعون تمہیں بتا رہا ہے۔“ وہ روئے گی۔ میں نے اسے تسلی دی۔ اور اسے لے کر فرعون کے حضور میں پہنچی۔ خود وہ میرے پہلو میں کھڑی کانپ رہی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی درون کی انگلیں دفترِ سرست سے پگھلنے لگیں۔ اس نے یوں ہاتھ کو پاس بلایا اور اسے اپنے پہلو میں بٹھالید پھر مجھے اور تمام خدام کو چلے جا۔ نے کا حکم دیا۔ ہم وہاں سے باہر نکل آئے۔

اسی خوشی میں جشن ہونے والا ہے۔

فرحون کی حکہ..... مصر کی حکہ؟

”تم جشن کی تیاریوں میں حصہ نہیں لے رہی ہواں؟“

میں خاموش رہی۔ اور وہ چلا گیا۔

”حکہ“ مصر..... یوروپا..... میری بیٹی، میں ان الفاظ کو بار بار دہرانے لگی۔ مجھے

ایسا محسوس ہوا کہ گریباں سے میری حقیقی بیٹی جھن گئی ہے۔ کاش میری یوروپا میرے ہی

پاس رہتی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکلی۔ اور جشن میں حصہ

لینے کی غرض سے چلی گئی۔ جتنی دیر میں وہاں رہی۔ انہی خیالات کا جہم میرے دماغ کو

بے قرار کرتا رہا۔ یوروپا سے ملنے کے لئے میں نے بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ

ہو سکی۔ جب میں اپنے کمرے میں پہنچی۔ تھکا دہک کے اسے میرا بڑا حال تھا۔ آنکھوں کی

کے پاس لمٹ گئی۔ شام کی سیاہی بندریچ بھیل رہی تھی۔ میرے سامنے تاملہ نظریاتی

ہاں، بانی تھا۔ جہاز فضا پر چھائے ہوئے گرد و غبار کو چہرتے ہوئے آہستہ آہستہ اُفتق

کی تاریکیوں میں غائب ہو رہے تھے۔ دُورا دیکھنے اور نچے درخت بننا کے جھونکوں سے

سرنگوں ہو کر آہیں بھر رہے تھے۔

محل کے صحن سے شور مٹائی دے رہا تھا۔ جشن شروع ہو چکا تھا۔ میں اٹھی اور محل

کے صحن میں پہنچی۔ میری نگاہیں جہازوں، جشن دیکھ چکی تھیں۔ مگر وہاں دشواری، آرائش و

زیبائش اس موقع پر دیکھی وہ میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔

ہر طرف روشنی کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ رنگین و منقش قالین بچھے تھے۔ جن پر طرح

طرح کے ریٹھی پھول بکھرے ہوئے تھے۔ رنگین و جمیل پردے لہرا رہے تھے۔ غرض کہ

پر چڑھ اپنی شان و تجل کے لحاظ سے گزشتہ تمام جشنوں سے بڑھ گیا تھا۔ لیکن جشن کی کوئی دلیچسپی جیسے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی تھی۔۔۔ میں اپنی یورو پا کو ڈھونڈ رہی تھی۔۔۔ یورو پا میری بیٹی:

میں آگے بڑھی۔ جسمی غلام قطار، قطار، قطار شرابیوں کے ساغر اٹھائے پھر رہے تھے، اور ہار بار میرے سامنے آجاتے تھے اس لئے میری نظریں یورو پا کو دیکھنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اچانک میں نے ایک طرف ایک ایسا منظر دیکھا کہ بے اختیار صوت ہو کر رہ گئی، یورو پا فرعون کے پہلو میں جیسی مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ نہایت خوش و خرم تھی۔ خوف کا ذرہ بھر احساس اس کے چہرے سے عیاں نہیں تھا۔

میرے دل میں خیال پیدا ہوا، حکمایہ وہی یورو پا ہے جو مصریوں کو دیکھ کر کانپ کانپ کر نجد سے لپٹ جاتی تھی؟ انخوامیں موڈ باز طور پر اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ اس نے اشارے سے مجھ بلایا اور اپنے تخت سے کچھ فاصلے پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں بیٹھ گئی۔ جشن آدھی رات تک ہوتا رہا۔

جشن کے اختتام پر یورو پا نے مجھے اپنے پیچھے چلنے کو کہا۔۔۔ ایک خادمہ کی طرح میں اس کے پیچھے چلنے لگی۔ وہ محل کے سب سے زیادہ خوب صورت، شاندار کمرے میں داخل ہوئی اور جگہ بھی اندو بلالیا۔ اور تمام خزانوں کو چلے جانے کا حکم دیا۔ ہم چند لمحے ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔

ہاں! میں تیری یورو پا ہوں۔

ہاں یورو پا میری بیٹی! میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مگر یہ آنسو خوشی کے تھے۔ تمہیں میری حالت پر حیرت ہوگی؟ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نیں خاموش رہی۔ اس سے اپنے سوال کو دہرایا۔

تھلے سے دھڑک رہا تھا اور بلند کر دے۔

تو میری ماں نہیں ہے؟ اس نے تہنقہ لگاتے ہوئے کہا۔

کیوں نہیں، میں تیری ماں ہوں..... یہ تو جانیے بے حد غلط ہوں کہ میری

بچی، سرک مکھ.....

نہیں خوشی ہے؟ اس نے میرے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا۔

بہت زیادہ اچھا میری بیٹی، مصر کی مکھ بنے، اور مجھے خوشی نہ ہو جائے کہ تم ہر مکھ ہے؟

اچانک اُس نے دوا دے کے پاس کسی کو دیکھا۔

وہ کیل ہے؟ اس نے ادھر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں اٹھی۔ دوا دے کے پاس پہنچی۔ وہاں سنگ مرمر کی ایک چھوٹی سی صندوقچی پڑی

تھی۔ میں نے اُسے اٹھالیا اور دیر پا کے پاس آگئی۔

یہ تو وہی ہے۔۔۔ وہی؟ یہ کہہ کر اُس نے صندوقچی کھول کر اس میں چند ریشمی بال

تھے اور اُن پر حزن کے چند قطرے جم گئے تھے۔ مجھے پورے عروس کا دھڑکے دلہا واقف واد

آگیا۔ یہ دھڑکے کی علامت تھی۔

دھڑکے کی علامت ہے؟ اس نے حذارت آمیز لہجہ میں کہا۔ وہ مجھے..... یعنی مصر کی مکھ

کو ڈھانا چاہتے ہیں؟

اُس نے صندوقچی کو رچھیک دیا اور میری طرف مخاطب ہوئی۔

نیں اب ذلیل کتنی کو سخت مرزدوں گی۔ میں مصر کی مکھ ہی کہ مصریوں کے سخت و

کس طرح جا سکتی ہوں؟

قدست ہے؟ میں نے کہا
 اب تم جاؤ۔ اس نے اُٹھتے ہوئے کہا: دیکھو میں تمہاری پوتہ پا ہوں۔ مجھے اپنی بیٹی
 ہی سمجھو۔ کدو میں کدو نہیں گئی۔
 میں بہت غور سے جھوٹی۔ ادا آہستہ آہستہ کر کے سے باہر نکل کر اپنے کمرے کو چلنے لگی۔!

(۶)

یونانیوں کا قتل

یورپا کدو مصر کی چکی تھی۔ جب وہ شاہی تاج پہنے خواصوں کے جوم میں نہنگار کرسی
 پر بیٹھ کر سر کو مغروانہ جنبش دے کر اپنے احکام جاری کرتی، تو اس وقت میں خود دھوکا
 کھا جاتی، اور کچھ پر مجبور ہو جاتی، اگر یہ وہ پوتہ پا نہیں ہے، جو ایک کدو کے پتے کی طرح
 ان ماں کوٹھ ہوتی مجھ سے لپٹ جاتی تھی۔ لیکن کی حالت بدل چکی تھی۔ وہ اب دنیا کی سب
 سے زیادہ شاندار سب سے بڑھ کر صبیح عورت تھی۔ دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ
 فرعون، اُس کا بھائی و دل پر سار تھا، اپنی خواصوں کے ساتھ وہ مجھے غلام رکھتی، مگر سب
 کہیں میں غوث میں اس سے ملتی وہ مجھے ان ہی کدو کے لہجہ کی ایک دلی میں اپنے کمرے
 میں منہی ہوئی تھی، کو میرا بیٹا میرے پاس آیا اور آتے ہی کہنے لگا:-

یونانی قتل کئے جا رہے ہیں!

یونانی؟ کہاں؟ میں نے پوچھا۔

مصر میں!

کیوں؟

”ملک کے حکم ہے“

میں جلدی سے اٹھی۔ صحن میں پہنچی۔ حدود پا ایک ذریعہ کو کسی پر بھیجی ہوئی تھی۔ دو
خواتین اسے گھڑی طرح کے پیدوں کا پٹکھا جھل رہی تھیں۔ اس کے پاس ہی سرخ و سرخوں
کی نو فرنگ مسرک سب سے بڑی دوسرے فرنگی ایک معمولی خادمہ کی طرح کھڑی تھی۔ اس کے
سلسلے مصری جلد بوند تھتھے دکھا کر ایک ایک دکان کو چورتے پر کھڑا کر کے اس کا
سر قلم کر دے تھے۔ بے شمار بلبلوں کی طرح غریب میں تیر رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر یونانیوں
کی ایک جماعت زنجیروں میں پکڑی ہوئی کھڑی تھی۔ وہیں عروس دھبی پلٹ کر
بوندہ جو میں نے کئی بار دیکھا تھا۔ اور جو رو دیا کر لے گیا تھا، کھڑا نظر آ رہا تھا۔ فضا میں پائپل
کی درد نگ جھنجھیں اور داغیں اٹھائیں گونج رہی تھیں۔ یہ سب بارے لطف سے اس غریب منظر
کو دیکھ رہی تھی۔ میں خاموشی کے ساتھ دیکھنے کے دائیں طرف کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ جلد
برابر اپنا کام کر رہے تھے۔ ماہ! اس وقت کا منظر کتنا درد انگیز تھا۔ سب کوئی یونانی چور
پر کھڑا کیا جاتا۔ وہ بلند آواز سے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو جنبش دے دے کر رحم کی التجا
کرتا۔ یورو پاتھ تھک کر اپنے ہاتھ کو جنبش دیتی اور اس کے ساتھ ہی یونانی کا سرکٹ کر غریب
میں تیرنے لگتا۔ غایا سڑی مصر میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک عورت ایسے وحشیانہ قتل کا حکم
دے رہی تھی اور پھر اس میں دلچسپی لے رہی تھی۔ سرکٹے گئے، یہاں تک کہ دو یونانی باقی نہ
گئے۔ اب چورتے پر بوندھے عروس کو لایا گیا۔

”کچھ یونانی کے ہوتے گئے؟“ کیا اب بھی تجھے یونانیوں کی ہمدردی کا خیال ہے؟

”ملک مصر؟“

ہر دہانے دربارہ تہقیر لگایا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تو سرری حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانا چاہتا تھا کیا غیر مستحسن نہیں، ملکہ مصر!“

”نہیں.....“ وہ ذرا روکی اند بھر کہنے لگی۔ ”مجھے شدید سزا دینی چاہیے۔ مگر میں تجھ پر رحم کھاتی ہوں۔ تجھے جہاز سے پانی میں پھینکا جائے گا، اور تیرا لڑکا جسم بچھڑیوں کی تزیینات پر لٹا دیا جائے گا۔ وہ پھر خادموں سے مخاطب ہوئی۔ ”جہاز اسے لے جاؤ اور میرے حکم کی تعمیل کرو۔“

مقام اُسے لے گئے۔ اس کے بعد جلاؤ چھوڑنے کی طرف ایک نہایت مشکل کوچہ یونانی زوجہ کو لائے۔ خوت کی کوئی علامت اس کے چہرے سے عیاں نہیں تھی۔ وہ چھوڑنے پر اس خراج بڑھاپا آ رہا تھا۔ گویا ایک فتح منہ ہمارے منقلب دشمن کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یوڈ پاسے حیرت سے اُسے دیکھا۔ اور جلاؤں کو اسے پاس لانے کا حکم دیا۔ جلاؤ اسے ملکہ مصر کے سامنے لائے۔

”تمہارا نام کیا ہے زوجہ؟“ یوڈ کا لمبہ بہت حد تک نرم تھا۔

”میریون! یونانی سپاہ کا ایک افسر!“

”مجھے اپنی موت سے ڈر نہیں آتا؟“

”نہیں!“

”مجھے زندہ رہنے کی آرزو ہے تو کو.....“

”اپنے ساتھیوں کو مرتے دیکھ کر زندہ رہنا بزدلی سمجھتا ہوں؟“ اس نے ملکہ کے الفاظ کا شے بھٹکے کہا۔

”کیا اب بھی تیرے دل میں اپنے ساتھیوں کی ہمدردی کا خیال ہے؟“

ہاں! میرے پہلو میں عورت کا دل نہیں ہے۔ جو دھڑکے مگر جاتے۔ اور شان و شوکت حاصل کر کے، اپنے آپ کو، اپنی حیثیت کو اور اپنے فرائض کو بھول جاتے! جانتے ہو، تم اس وقت کس کے سامنے کھڑے ہو؟" لکھنے نے شگفتگی لہجہ میں کہا۔

ابھی حرج چاٹتا ہوں۔ لکھنے ہر عکس مصر اور اور.....؟

اور حقیقت میں ایک بزدل، بیاہن خلی عورت کے سامنے!!

یہ تو بالکل کر کھڑی ہو گئی۔ جلاؤں، خزانوں اور خادموں پر تاننا چھا گیا۔ اُس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ چہرہ فریاد غضب سے سُرخ ہو گیا تھا۔

یونان کے ذلیل گئے، تمہیں اتنی جرات؟

مگر یونان کا ذلیل کتا ایک بیاہن خلی عورت سے بدتر ہے۔ —! مجھ تو کہیں ہو۔ کس سر زمین نے تجھے پیدا کیا۔ کیا تم نے یونان کی، غرض میں پرورش نہیں پالنا؟ جلاؤں سے اُسے بکڑیا۔ اور اُسے گھسیٹ کر پیچھے لے جاتے تھے۔

اُسے قید خانے میں لے جاؤ۔ یہاں جلاؤں کی حرمت مخاطب ہو کر کہا: میں اسے دنیا کی سب سے ترین سزا دے کر اداں گی۔

جلاؤں سے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ اس کے بعد قید خانہ لے گئے، اور اپنے خاص کمرے کی طرف چلتے گئے۔ اُس نے مجھے اپنے ساتھ چھنے کا اشارہ کیا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے تمام فراہم کردہ خدمت کر دیا۔

"تمام برائیوں کو میں نے قتل کر دیا ہے۔ میرا فعل تمہاری نظر میں درست ہے؟"

اس نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

مُصِیح میں نے تمہیں چند ناز و شکوہ فقرے کہے تھے۔ تم اُن سے ناراض تو نہیں ہو گئیں؟
اس نے مجھے مایوسی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس وقت وہ کس قدر پیاری بھولی بھالی نظر آ رہی تھی۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کر
مجھے وہی یسوعا یاد آ گئی جو مصر بیل کے خوف سے ہر وقت ڈرتی رہتی تھی۔ فُٹند
کرنچ سے لپٹ جایا کرتی تھی۔

”نہیں! میں تم سے ناراض نہیں ہوں، ملکہ مصر! میں نے جواب دیا۔

”اُن! تم مجھے ملکہ مصر کیوں کہتی ہو؟ میں تمہاری بیٹی یسوعا ہوں۔ مجھے اسی نام
سے پکارو!“
”یسوعا!“
”اُن! ہاں!“

میں نے مادانہ شفقت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”تم غلین کیوں ہو بیٹی؟“

”ہاں ماں! یہی غلین ہوں!“ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک پڑے۔
”میں ایک مشکل میں ہوں!“
”کس مشکل میں؟“

”تم نے نہیں سنا ماں!“ اس نے توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔ ”فرعون دوبارہ ایک
رقاصہ کو ہانپنے لگا ہے۔ میری آنکھوں نے خود فرعون کو اس رقصہ سے ہاتھیں
کرتے اولہ سے اپنے پاس بٹھاتے دیکھا ہے!“ اس وقت وہ اس کے پاس ہو گئی۔ ”وہ پھر
شہری اور آہ بھر کر کہنے لگی۔ ”میں کتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں ماں؟“

کیا کروں؟ آہ محبت میں عورت کتنی کمزور کتنی مجبور ہو جاتی ہے؟
میں اس کے آنسو بہہ نہ چکے لگی، اور ساتھ ساتھ اُسے تسلی دیتے لگی۔

اگر فرعون وقاص پر مہربان ہو گیا ہے تو تمہیں ہرگز غم نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ وقاص
آخر وقاص ہے اور تم؟ — مصر کی مکہ؟

اگر ایسا ہوتا تو فرعون مجھے چھوڑ کر کیوں ایک ذلیل وقاص سے محبت کرنے لگتا؟
ماں میں مصر کی مکہ بننا نہیں چاہتی، میں فرعون کی محبت چاہتی ہوں۔
یہ فقر و سحر میں حیران ہو گئی۔ وہ کیا سے کیا بنی جا رہی تھی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

اُس وقت یہاں کون آ سکتا ہے؟ یوروپا نے پرچھا۔

دردانے پر آہستہ آہستہ دستک ہو رہی تھی۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا میرے
سامنے غزنی ٹکڑی تھی۔

نہیں مکہ مصر سے ملنا چاہتی ہوں! اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

اس سے پیشتر کہ میں اس سے کچھ کہوں، یوروپا نے اس کی آواز میں کراہے اپنے
پاس بول دیا۔ اس وقت اس کی شاہانہ عظمت سخت مروج تھی۔

اُس وقت تمہیں یہاں آنے کی جرأت کیونکر ہوئی؟ یوروپا نے اس سے پوچھا۔

میں ایک نہایت ضروری بات مکہ سے کہنا چاہتی ہوں۔ اس نے جواب دیا۔
کیونکہ کیا کہنا چاہتی ہو؟

غزنی نے میری طرف دیکھا، اور چُپ ہو گئی۔..... پھر مجھے چلے جانے کے لئے کہا۔
تمہیں، اگلیطی یہیں ٹھہرے گی۔ وہ میری ہمراہ ہے، اس سے کوئی بات پریشان نہیں

رو سکتی۔ کہو، کیا بات ہے؟

تیس یہ کہنے آئی ہوں..... کہ فرعون، رفاصہ اقصیٰ سے محبت..... میں نے مناسب سمجھا کہ مکہ مصر کو بات بتا دوں۔

دیکھا، اگلیں؟ یوروپا نے مجھ سے مخاطب ہو کر حسرت آلود لہجے میں کہا: یہ بات کس کو معلوم نہیں؟

میں خاموش رہی۔ یوروپا اٹھ کر رے میں ٹپکنے لگی۔

ذلیل رفاصہ..... زہریلی ناگن..... میں اس کا سر کچل دوں گی۔ اس قسم کے الفاظ اس کے لبوں سے نکل رہے تھے۔ ہم دونوں سائرش بیٹے تھے وہ پھر ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ لیکن مکہ مصر میں صرف یہی بات نہیں کہنے آئی، لفرنتی نے کہا۔ یوروپا نے اُسے متعجباً دیکھا:

تیس مکہ مصر! تم سے ایک چیز مانگنے آئی ہوں، لفرنتی نے کسی تند جوش میں کہا۔

عات سات کہو، لفرنتی!

میں تم سے ایک شخص مانگنے آئی ہوں۔

ایک شخص؟ کون؟ مکہ مصر نے خٹکیں لیجے میں کہا

میں مکہ مصر سے یونانی نوجوان، میرون، مانگنے آئی ہوں!

کیا کہہ رہی ہے لڑخاومر؟

میں خاومر ہوں..... مصر کی مکہ! مگر محبت کے راستے میں، ہم دونوں کی ایک

ہی حیثیت ہے۔ تم فرعون سے محبت کرتی ہو۔ اس لئے اُسے کسی دوسری عورت سے محبت

کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتیں، بلکہ میرون سے محبت ہوگئی ہے، اس لئے میں اُسے موت

کے بچے ہیں نہیں دیکھ سکتی۔

”ایک خادمہ کے کہنے پر میں ایک گستاخ شخص کی زندگی بخش دوں.....؟ یہ

کبھی نہیں ہو سکتا!“

”مکہ مصر! یہ بھی دیکھو، تمہیں بھی فرعون سے محبت ہے!“

”میں زیادہ باتیں سننا نہیں چاہتی۔ جاؤ، میری نظروں سے دور ہو جاؤ!“

”خدا نے رع کے بھل کے لئے مجھے میرول کے دے دو!“

”اگر تم نے زیادہ اصرار کیا تو اس کے ساتھ تمہیں بھی سخت سزا دی جائے گی!“

”سُن کر نفرتی کا نب اٹھی۔

”مجھ پر رحم کرو، مکہ!“

”میں میرول کا ایک بال بھی تمہیں نہیں دوں گی۔“

”مکہ مصر! یہ سُن کر فرعون ایک دوسری عورت سے محبت کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر

کہ تمہارا محبوب ایک دوسری ہستی کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے، اُم کنتی بے قرار ہو گئیں

..... مگر اس عورت کے دل کا اندازہ لگاؤ، جس کا محبوب موت کے بچے میں

گرمنا ہے..... مجھ پر رحم کرو، مکہ!“

یہ دیکھتا ٹھٹھکی، نفرتی منت سماجت کرتی گئی۔ میں خاموشی سے باری باری ان

دونوں کے چہروں کو دیکھتی رہی۔ یہ ایک پردہ کی آنکھیں پکٹنے لگیں، اور وہ نفرتی کے پاس

آکر بیٹھ گئی۔ اور اُسے خند سے دیکھ کر کہنے لگی:-

”میں ایک شرط پر میرول تمہیں دے سکتی ہوں۔“

”کیس شرط پر، مکہ؟“ نفرتی نے جلدی سے کہا۔

”تم یہ شرط کو پوری کرو گی؟“

”کیونکہ وہ کرنے کی شرط ہے، میری جان بچانے کے لئے میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔
تو میں اپنے محبوب کی جان بچانے کے لئے ایک ہستی کا خاتمہ کرنا ہو گا!“
”نہی!“

”تو میں کسی نہ کسی طرح اس ذلیل رفاقت کو ہٹا کر دینا ہو گا.....!“
”مجھے اُمید تھی کہ یوں نہ ہو، نفرت ہی ہے یہ شرط کے گی!
”رفاقت کو.....؟“ فرعون کی.....؟“

”بس میں: میں اُسکے سُنا نہیں چاہتی۔ یہ شرط پوری کرنے پر تیار ہو؟“
”میں یہ شرط پوری کروں گی، ہلکا!“
”جب میں رفاقت کی نفرت دیکھ لوں گی۔ تو میری جان، آنا دے کر کے تمہیں دے دوں گی۔
اس وقت تک وہ قید میں رہے گا۔“

”حکمران مصر!“

”مجھ پر اعتبار کرو، نفرت ہی! کیا تم وعدہ کرتی ہو کہ اس شرط کو بہت جلد پورا کرو گی؟“
”نفرت ہی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور ساتھ ہی اپنے سر کے چند بال تزیین کرنا دیکھا کر دے
ٹپے۔ یوں دیکھنے بھی اپنے سر کے چند بال پیش کر دیئے۔“

”دیکھو اپنا وعدہ بھول نہ جانا۔“ میری جان کی زندگی تمہارے وعدے کی تکمیل پر منحصر ہے۔
میں اپنے محبوب کی جان بچانے کے لئے یہ شرط ضرور پوری کروں گی۔“
”جانی اب بھی جاؤ!“ حکمران نے کہا
”کل شام تک میں یہ شرط پوری کروں گی۔“

یہ کہ کردہ اٹھی اور بکری سے خاموشی کے ساتھ نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد یورو پائے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی پائی ہوئی تھی۔

یہ عجیب واقعہ ہے؟ میں نے کہا۔

ہاں، اماں! محبت میں عورت کیا کچھ نہیں کرتی؟ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے

دو شفاف قطرے نکلے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں نیند آئے گی۔ جب وہ سو گئی۔

تو میں اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

(۸)

خزانے کی تلاش !

رقاصہ موسمِ شراب پیکر مار ڈالی گئی۔ لیوڈ پائے حسب وعدہ یونانی نوجوان بیرون کو

آزاد کر دیا۔ رقصہ کی موت کے بعد لیوڈ پائے کے راستے میں کوئی بھی حائل نہ تھا۔ ذرا دیر کے

پچھلے سے بھی زبان چا چنے لگے۔ اور ملکِ مصر کردہ عظمت و اقتدار حاصل تھا، جو آج تک کسی

عورت کو بھی حاصل نہ ہو سکا تھا۔ اپنی شان و شوکت کی نمائندگی کی غرض سے وہ انتہائی طور

پر فضول خرچ ہو گئی تھی۔ شاہی خزانہ مسلسل اُس کی آواٹوں اور زیبائشوں پر صرف چڑھتا تھا۔

رقاصہ کو مرے ہوئے جس دن گذر چکے تھے۔ اب میں دنوں میں اُس نے متعدد جشن

کئے جن میں ملک نے بیرون اور بیرون کو پتھر کے معمولی ٹکڑے سمجھ کر اپنے حادوں میں لٹایا

خزانے کا بہت بڑا حصہ ان فضول چیزوں میں ختم ہو گیا۔ مگر غصہ بالکل بے استیلائی برابر بڑھ

رہی تھی، اور دولت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار مجھ سے کہتی تھی۔

کہ یہاں کے کھنڈوں میں خزانہ دفن ہے۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مصری اپنے حکمرانوں

کے نابالگوں میں دولت بھی رکھ دیتے ہیں۔ مجھے دولت کی محنت ضرور ہے۔ کیا تم میرا مدد کرنا؟

نہیں، اگلے بھرا! ایسا نہیں ہو سکتا!

نہیں؟ وہ غصے سے کہتی۔

تھنڈوں کا قہقہہ ہتہ نہیں ہے، اور آبروزں سے ہم خزاں کہیں سودت میں بھی نہیں نکال سکتے کیونکہ یہاں مُردوں کے احتیاج کو محجوع کرنا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ اس جرم کو خدا نے راج بھی صاف نہیں کر سکتا۔ یہ ٹی کر د، مجھ سے خفا ہو کر نکلی جاتی۔

ایک پانچویں رات کو ہمارا جہاز اڈہ نیل کی آغوش میں آہستہ آہستہ دواں تھا۔ بدبو دار نہ تھا۔ کسی پر ممکن تھی۔ اس کے پہلو میں نہایت قیمتی رکھنے والے سو تیل کا بیجوم بکھرا ہوا تھا۔ اور اس کے سامنے بے شمار حبشی خدام، بڑا سید لٹروں سے لُٹے دیکھ رہے تھے۔ یہ تو ایک خاص شان سے شراب کا ایک گھونٹ پیچا، اور گھونٹ پی کر موتوں کو بے دردی سے جہاں میں بھیج دیتے تھے۔ حبشی اُنھیں حاصل کرنے کے واسطے دامن پھیل کر اُدھر اُدھر بھاگتے گئے۔ اور اسی کو شمش میں ان میں سے چند باقی ہیں گر پڑے ہیں پانچ تھہر لگاتی اور پھر موتوں کو بھیج دیتی۔ یہ سو تاک دو دایکھر منظر اس کے واسطے بہت دلچسپ کھیل تھا۔ موتیوں کی کثیر تعداد باقی ہیں گروہ بھی۔ اور ان کے ساتھ متعدد حبشی بھی اپنی جانیں ضائع کر رہے تھے۔ کہانی دیر تک یہ کھیل ہماری رہا۔ آخر جب موتی ختم ہو گئے تو قہقہہ ہانکے ہمارے پر خشکی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اپنا دلچسپ کہیں جاری رکھنے کے لئے اب اس کے پاس سامان نہیں تھا۔ اس نے شراب کے ذریعے سازوں کو ہمارے نیچے پھینک دیا۔ اور باقی افراد سب پر دھاتی کے ساتھ پاؤں سے ٹھکراتی ہوئی غلوت میں چلی گئی۔ میں ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ منکوم حبشی غصے سے کھا کھا کر اپنی جگہ چپا کے لئے ہمارے کھٹے کو پکڑ لیتے تھے۔ طرح اُن کی حالت زار دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے اور چپٹوں سے ان کے سر پر ہنسنے لگے تھے۔ کہ ایک طرف سے غضب انگ آواز سنائی دیتی۔

خاموش کھڑا

میں نے دیکھا کہ یودو پا ایک طرف ہمدہ ہٹا کر خشکیں نظروں سے لٹاؤں اور خاموشیوں کو دیکھ رہی ہے۔ ہر طرف سکوت چھا گیا۔ یودو پا پھر اندھ چلی گئی۔ ہانے سے پیشتر اس نے مجھے دیکھا مگر بے پروائی سے۔ یہی وہ یودو پا تھی۔ جو کبھی میرے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اور یہی یودو پا تھی جسے میری زندگی بھر پرانی نہیں تھی۔

پانچ سالے جہاز کے سین اوپر چپک رہا تھا ہالیوڈ ہرق ہوتے ہوئے جیشیوں کی دردناک جینیں سکوت کو زخمی کر رہی تھیں۔ میں کافی دیر تک دریا کے مناظر کو دیکھتی اور لٹاؤں کی گھنگھری سن رہی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ اسی دوران میں میری آنکھ لگ گئی۔ اپنا لگ میری پشت پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میری آنکھ کھلی گئی۔ یودو پا میرے پاس کھڑی تھی۔ اس کا ہمدہ غلط مسرت سے سُرخ تھا۔

”ہلو میرے ساتھ.....“

میں گھبرا کر اٹھی اور اس کے ساتھ ایک طرف گئی۔ وہاں لڑتی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سوا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ یودو پائے فریج کی کچے جالنے کا حکم دیا۔ اور خود میوے پاس بیٹھ گئی۔

”تم نے مجھے کچھ پتہ نہ بنایا مگر میں نے آخر معلوم کر ہی لیا؟“

”کیا؟“

”خزانہ.....!“

”خزانہ؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ کہاں؟“

”میں نہیں بتا سکتی!“

”میں نے تمہاری بات بھی نہیں!“

بوند پاسے حد خوش تھی، میں اُسے سیرت سے دیکھنے لگی۔
 ناں نہیں معلوم نہیں ہے۔ خزانے کا پتہ کس نے بتایا ہے؟
 نہیں یاد دہا!

نہیں نہیں بتاتی ہوں۔ خیر تھی نے اس اسمان کے بدلے، ایک ایسے خزانے کا پتہ
 بتایا ہے جو میری زندگی میں کبھی بھی ختم نہ ہوگا۔
 مگر..... یاد دہا!

نہیں، میں کچھ بھی گنتا نہیں چاہتی۔ اس نے میرے الفاظ کا تکرار کیا۔ مجھے خیر تھی پر پورا
 بھروسہ ہے۔ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتی، اگر خزانہ نکلا تو میں اُسے اور میری کو فدا کر دوں گی۔
 خزانے روح کے.....

اُس وقت میں اُدھر نہیں رہتی تھی..... مجھے دولت کی اذیت ضرورت ہے۔ کل رات
 کہ میں، افسر علی احمد تم ہم تھک چکیں گے۔
 کہاں؟
 کہاں؟..... جہاں رہ لے جائے گی؟

تم تم سے تھک کر اسے جانتی ہوں بیٹی! میں خزانے زمی کے ساتھ کتنا شروع کیا۔
 کھنڈروں میں کوئی خزانہ نہیں ہے اور تابوتوں سے ہم..... کسی صورت بھی دولت
 نکالنے کی جرات نہیں کر سکتے!

مگر تمہیں میرے ساتھ چلنا چاہیے میرا حکم ہے؟ اس نے غصہ ناک لہجے میں کہا
 میں خاموش ہو گئی۔

میں چاہتی ہوں کہ ہمارے ساتھ کوئی مرد بھی جاوے..... ایک ایسا مرد جس پر میں

بھروسہ کر سکن کہ وہ دلا کو پروردہ انعام کے ہے؟

ایسا مرد کوئی ہو سکتا ہے؟

خادموں پر مجھے اعتبار نہیں ہے!

آخر یہ بات سنے ہوئی کہ میں اپنے بیٹے کی دعوت کو ہمراہ اپنے گئے مکوں۔ وہ صبح
دن صبح میں ان دعوت کو لے کر حکم کی خدمت میں حاضر ہو گئی۔

دیکھو، کسی کو اس کے متعلق خبر نہ ہو، حکم نے زاموت سے کہا

تھائے ریح کی قسم! میں اپنا دھندہ چلا کر آؤں گا:

قصر کھانے کے بعد میں اور میرا بیٹا وہاں سے واپس آئے۔

(۹)

ایک تحیرنا واقعہ!

جب رات کی تاریکی پھیل گئی، تو میں انفرنجی ایڈم دیا اور زاموت محل سے نکلے۔ انفرنجی جاتی
راہنما کی کہنے لگی۔ اس نے ہاتھ میں شمع دیاں لکڑی ہوا سا اور زاموت کے ہاتھ میں کڑاں تھا۔ ہم
ناموشی کے ساتھ چلنے کے ہر طرف نہ موشی مسند تھی۔ باقی کا مصلحہ سے کرتے کے بعد ہم کشتی
میں بیٹھ گئے۔ ملاح حکمت گاتے ہوئے کشتی کھینے لگے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ ان کی کشتی
میں کوئی سوار ہیں۔

آخر کار ہمارا ہی کشتی کنارہ آگئی۔ سامنے کے پاس درختوں کے مہیب سائے دیکھتے ہوئے
سامنے والے باغ دکھائی دے رہے تھے۔ پانی میں ساروں کے عکس رہتے آئی سیز کے تاج کے
موتیوں کی اندر چمک رہے تھے۔

ہم کشتی سے اُتارنے انفرنجی ہمارے آگے آگے پہنچے گی۔ چاروں فرزند ہیبت زدہ اور

و سخت، تاک نامرشی چھائی ہوئی تھی۔ میں برودیا کے پہلو پہ پہلو بیٹھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ
مسترجع اقلنے کی روشنی سے ہلکا رہا تھا اس کے برضات جب میں آگے بڑھ کر
فرتی کے چہرے کو دیکھتی تھی تو وہ کارمند نظر آتا تھا۔ وہ چلتے ہوئے بار بار ٹھہرتی
تھی۔ بے چینی سے ادر ادر دیکھتی تھی۔ اور پھر چلنے لگتی تھی۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد
ہم ”معدہ“ کے پاس پہنچ گئے۔ فرتی ٹک گئی۔

اب ہماری منزل مقصود قریب لگتی ہے۔ اس کے بہوں سے نکلا۔

تو ہلدی چلو۔ ہلدی پانے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

فرتی نے اپنا رخ ”معدہ“ کے دائیں پہلو کی طرف کیا اور چلتے لگی۔ توڑی دوں۔ چلتے کے بعد
بہیں ایک بڑا سا تودہ نظر آیا۔ فرتی تیزی سے اُس کے اوپر چڑھنے لگی۔ اور ہماری نظروں
سے غائب ہو گئی۔ ہم بھی آہستہ آہستہ چڑھنے لگے۔ شمدان فرتی کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے
تاریخیں ہیں کہیں کوئی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے بعد نہ نیچے اُترتی۔ اور خاموشی
سے ایک طرف و قدم اٹھانے لگی۔ ہم بھی اس کے پیچھے قدم اٹھا رہے تھے۔ ہمارے پاس
درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ میں نے سر کر دیکھا۔ عصبہ بیڑا کو بڑی اب لگا ہوں
سے زمین میری تھی۔ یہ ایک فرتی ایک جگہ ٹھہر گئی۔

ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ یہ کیا ہلدی پانے مضطربانہ کہا۔

ہاں، مکہ مصراۃ کہہ کر۔ چند ٹوٹی پھوٹی میز میزوں کے اوپر چڑھنے لگی۔ آخری میز
پہنچ کر ہمیں ایک فراخ جگہ ملی۔ اس جگہ کھٹے کھٹے کے بعد پھر میز تھیں۔ ہم اُن
سے نیچے اُترے۔ اور ایک شکستہ دروازے میں سے گزرنے لگے۔ ہمارے دونوں طرف
دوب سرائ کی ٹوٹی چھوٹی دیواریں کھڑی تھیں۔ چند قدم طے کرنے کے بعد فرتی نے ہم سے

مخاطبہ ہو کر کہا :-

آپ ہم اعلیٰ جگہ پہنچ گئے ہیں۔

لگے پھر یہ عجیبیاں تھیں۔ ایک نیچے اترنے کے بعد ہم نے غار کو چھوٹے سے کمرے میں پایا۔ میں نے مدغم روشنی میں دیکھا کہ ہمارے ارد گرد کڑی کے بڑے بڑے صندوق پڑے ہیں۔ میں نے ایک صندوق کھولا۔ اس میں ایک محفوظ خندہ لاش تھی۔ میں نے اُسے جلدی سے بند کر دیا۔ اس وقت ہم قبرستان کے چٹے جھتے سے گزر رہے تھے۔ خوف و ہراس میرے دل پر طاری تھا۔ میرا ہاندا میٹا بھی ڈر رہا تھا۔ میں یورپا کے ہوسے کو نہ دیکھ سکی۔ کیونکہ وہ نفرت کی کھال پہن چلی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے سامنے ایک شگاف میں بگھے مدغم سی روشنی دکھائی دی۔ اور یہ دیکھ کر میں سخت متعجب ہوئی کہ نفرت جی اس شگاف کی طرف بھا رہی ہے۔ اس کے قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ چھوٹا سا دروازہ ہے۔ نفرت جی نے ہاتھ بڑھا کر خفیہ دکان کھولا۔ اس کے باہر رکھ دیا۔ اور غار وہاں سے گزر گئی۔ ایک بعد دیگرے ہمیں بھی وہاں سے گزرتا ہوا وہاں پہنچ کر اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ نہ تو وہاں نفرت جی ہے نہ شعلہ ان پتھر کی ایک چٹائی کے اوپر دو تین چراغ جلیں رہے تھے۔ میں نے بعد پا کا ہاتھ پکڑا اور چراغوں کی طرف چلنے لگی۔ ابھی ہم اس کے قریب ہی نہ پہنچے تھے کہ ہمارے کانوں میں نفرت اکیز قہقہوں کی آواز آئی۔ ہم ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔

”لگے آجاکا۔ وہیں سے نجانہ لہجے میں آواز آئی۔

ہم حیران رہے۔ ہمارے آگے بڑھے اور یکایک میں لڑ گئی۔ بوڑھا مومس چٹان پر بیٹھا ہوا ہے۔ دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے ہاں نفرت جی اور میری دھڑکنے لگی تھیں۔ ایک طرف چھوٹی سی دکان میں شعلہ پکڑے اس طرح کھڑے تھے، گویا ابھی ہم پر حملہ کر رہے تھے۔

زیادہ دغا باز کون ہے؟..... یہاں ہلکن عورت! اب تو تڑپ تڑپ کر یہاں جانا ہے
گئی۔ تمہارے ساتھی بھی یہیں مر رہے گئے۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اور پوچھا کہ چہرے کو بغیر دیکھتا رہنا پھر اس کے ہاتھوں
کو پکڑنا، اور بلند آواز میں کہنے لگانا۔

”یہاں تم یونانی نہیں ہو، یونان کی سرزمین نے تمہیں زندگی نہیں بخشی؟ نہ یوں تجھے ابدی
خدا۔ میں جتنا کہے۔ تم نے اپنے بھائیوں کو قتل کر دیا، خوش محسوس کی؟“

”خوس!“ یو تو ہائے دوبارہ کہہ۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”میں اب بھی تجھے آزاد کر سکتا ہوں۔ تیری زندگی بچا سکتا ہوں۔ مگر ایک شرط پر۔ بتاؤ
اس شرط کو پورا کرو گی؟“

یو تو خاموش رہی۔

”نہیں..... تمہیں فرعون کو ذہر دے دینا ہوگا۔۔۔۔۔ اس کی موت کے بعد بھی تم ملکہ
مصر رہو گی۔ پھر ہمیں مصر میں سے بڑھ کر دولت و مرتبہ دینا ہوگا۔۔۔۔۔ بولو یہ شرط منظور ہے؟“
فرعون کو ذہر؟“

”ہاں یو تو بیا!۔۔۔ میری بیٹی، مصر کی ملکہ! تجھے ہی کہنا ہوگا۔ ہزاروں یونانیوں کو بچے
قتل کیا گیا ہے۔ ان کے خون کے ہر قطرے کا یہی مطالبہ ہے۔ تم یونانی ہو، ملکہ مصر کا خرد
تجھ سے تیرا بچتا نہیں چھین سکتا۔ بولو جواب دو؟“

یو تو خاموش رہی۔

”تمہیں یہ شرط منظور ہے!“ خوس نے یہ کہتے ہوئے اس کی بیٹی کی ہر تہ سے زعم لگایا۔
اس میں سے خون بھنے لگا۔ میں ڈر گئی کہ یہ ظالم کیا کرنے لگا ہے۔

اس کے اوپر اپنے دونوں ہاتھ رکھوا اور خدائے زیورس کے جہاں کی قسم کھا کر وعدہ کیا کہ تم ہماری شرط پوری کرو گی؟

میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب یہ تو پاس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا تب تم آواز دو۔ اور ابھی محل میں پہنچ جاؤ گی؟

عموس کے حکم سے 'میرون' نے ایک طرف سے بڑا سا پتھر اٹھا دیا۔ عموس نے یہودیہ کا ہاتھ پکڑا اور وہاں سے گزر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد باقی ایرانی بھی باہر چلے گئے۔ میرے سامنے باہر نکلنے کا راستہ موجود تھا۔ مگر میں نہیں نکل سکتی تھی۔ ایک تو مجھے اپنے بیٹے زاحمت کی فکر تھی اور دوسرے مجھے یہ بھی خوف تھا کہ جرنی میں باہر نکلیں۔ وہ مجھے پھر گرنا دکھائے گی۔ اچانک پاس ہی ایک شکات نظر آیا۔ میں نے چراغ اٹھا کر اُس کے ہمد دیکھا۔ زاحمت ایک طرف کھڑا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے بلایا اور اُسے شکات میں سے نکل کر اپنے پاس آنے کے لئے کہا۔ جب وہ پاس آ گیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے رخسارے خراب ہو رہا تھا۔ سر کے بال بھی خون میں شرابور ہیں مگر اس وقت کیا ہو سکتا تھا۔ سب سے پہلے تو ہمیں رانی حاصل کرنا تھی۔

”ہاں! اب ہمیں یہیں سنا ہر گا۔ کلمہ معصوم کہاں ہے؟“

”وہ..... چلی گئی!“

”چلی گئی، کہاں؟“

”وہ یہاں سے نکل گئی ہے۔ مجھے بھی راستہ معلوم ہے۔“

”تو ہم کیوں نہ نکلیں۔“

”باہر ایرانی کھڑے ہیں۔“

کوئی پروا نہیں۔ زامرت نے پُر جوش آواز میں کہا۔

ہم ہی راہ سے باہر نکلے۔ باہر کامل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں ستارے
چمک رہے تھے۔ ہیں کوئی یونانی نہ ملے گا۔ آخر تیزی سے قدم اٹھانے لگے۔ ہزار وقت
مائل میں یہ پہنچ گئے۔ اب محل تک جانا آسان تھا۔

(۱۰)

فرعون کو زہر دیا جاتا ہے۔!

جب ہم محل میں پہنچے تو صبح کی روشنی بتدریج کھیل رہی تھی۔ میرا دل بے پروا سے شے
کے لئے بہت بیتاب تھا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے زامرت کے زخموں پر کچرا بانٹ دیا۔
وہ جنگ پر لیٹ گیا اور قہقہے دینے کے بعد سو گیا۔ میرے جسم کے ہر عضو میں درد محسوس
ہو رہا تھا۔ دماغ سرچند سے تھک گیا تھا۔ لیٹ کر لیٹ گئی۔ مگر نیند کہاں؟ آخر جب سوج
کی کرنیں کھڑکیوں سے داخل ہو کر میری آنکھوں میں چھپنے لگیں۔ تو میں اٹھی اور بیروں پر
تلاش کرنے لگی۔ ابھی اس کی تلاش میں سرگرداں تھی کہ میرے کانوں میں قہقہوں کی آواز سنائی
دی۔ میرے پاس چند خرافہیں کھڑی ہوئی سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ ایک طرف
چلی گئیں۔ میں دسے پاؤں آگے بڑھی قہقہوں کی آواز پھر میرے کانوں میں آئی۔ چند قدم
آگے بڑھنے کے بعد میں نے دیکھا کہ فرعون تخت پر بیٹھا چلا رہا ہے۔ اور اس کے سامنے بیٹھ پایا
سنگ مرمر کے ایک چوڑے کے ساتھ کھڑی ہے۔ چوڑے پر شراب سے بھرے ہوئے سلفر
دکے بھرتے ہیں۔ بوند پونے پاؤں میں سنہری پچلیں پہنی ہوئی تھیں۔ اندام کا جسم نرم خوبیاں
تھا۔ فرعون اُسے سحرانہ دیکھ رہا تھا۔ اور وہ تمام قائل آبادوں سے اسے مغلوب کر رہی تھی

میں دیوار سے لگ کر یہ منظر دیکھنے لگی۔

یودو پانے ایک سنری منہ تپے سے دو چمکتے ہوئے موتی نکالے اور انھیں ساغر میں ڈال دیا۔ وہ ساغر فرعون کی طرف بڑھایا اُس نے ہند گھونٹوں میں اسے ختم کر کے ساغر کو پر سے پھینک دیا۔ اس کے بعد یودو پانے دو موتی نکالے اور انھیں بھی ساغر میں ڈال کر خدو پی لیا۔

”تین ایک چیز کی کمی محسوس کر رہی ہوں!“ یودو پانے قہقہہ لگایا اور ایک خاص انداز سے فرعون کو دیکھنے لگی۔

”کون سی چیز؟ کیا دنیا میں کوئی چیز ہے۔ جو فرعون تہیں نہیں ملے سکتا؟“

”مجھے ایک چیز کی ضرورت ہے!“

”کو وہ کیا چیز ہے؟“

”وہ چیز۔“ یودو پانے چند اور موتی نکالے اور انھیں ساغر میں ڈال کر کہنے لگی۔

”تم سمجھتے ہو کہ مصر میں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کی جاسکتی ہے۔“

”ہاں!“ فرعون نے اٹھ کر کہا۔ ”فرعون کی عظمت و قوت کے سامنے میں وہ کراہیسا

نہیں ہو سکتا۔ یہ فرعون کے اقتدار کی توہین ہے!“

”جہاں تک دولت کا تعلق ہے، یونان مصر پر فوقیت رکھتا ہے۔“ یودو پانے قہقہہ لگایا۔

”یونان؟“ چند دہانوں کے بعد یونان کی تمام دولت تم اپنے قدموں پر بکھری ہوئی پائیگا۔

”ایسا ہو سکتا ہے؟“

”فرعون کی طاقت ایسا کر سکتی ہے!“

”مجھے دولت کی سخت ضرورت ہے۔“

پنچدہویں ملک دنیا کی تمام دولت حاصل ہو جائے گی؟

یورڈو ہائے ایک اور ساغر اٹھایا اور اُسے فرعون کے ہاتھوں میں دے دیا۔

فرعون کی محبوبہ کسی چیز کی کمی نہیں محسوس کر سکتی اس نے صحبت انگیز نظروں سے یورڈو

کو دیکھتے ہوئے کہا، اور ساغر کو منہ سے لگا لیا۔ اپنا ایک یورڈو پاکے چہرے کا رنگ بدلے لگا

آنکھوں سے دشت برہمنے لگی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی، اور ساغر کو فرعون کے منہ سے

ہٹا کر ایک طرف پھینک دیا۔ فرعون حیرت زدہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

تیس نے اس میں..... کوئی موتی نہیں ڈالا تھا۔ یورڈو نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

آہو! فرعون نے تعجب سے لگا لیا..... مگر تم کا پ کیوں رہی ہو، تمہارے چہرے کا

رنگ زندہ کیوں ہو گیا ہے؟

نیر سے چہرے کا رنگ زندہ ہے، واقعی؟ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی مسکراہٹ

صاف طور پر مصنوعی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے چند موتی ایک ساغر میں ڈالے اور اسے فرعون

کی طرف بڑھایا۔ فرعون نے اسے ختم کر کے یورڈو پاکے چہرے پاس بٹھایا۔

یونانی عورت: ایک ایک مجھے قریب سے بہت آہستہ آواز سنائی دی۔

یورڈو پاکے آٹھی، میرے پاس آ کر دیکھنے لگی۔ میں دیوار سے لٹ گئی۔

ذلیل ہوئے! یورڈو ہائے بلند آواز میں کہا۔ فرعون بھی اٹھ بیٹھا اور میرے پاس ہی

سے عبوس کو گھسیٹتے ہوئے تخت کے پاس لے گیا۔ ابھی تک ان میں سے کسی کی نظر اٹھ پر نہیں

پڑی تھی۔ تم کون ہو؟ فرعون نے گرجتے ہوئے کہا۔

یونانی عورت: یونانی عورت! تمہارا وعدہ تمہارے نے یورڈو پاکے طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نہیں اس نبیہ وارڈ سے کوئی کہنا نہیں پتا تھی۔ یورڈو ہائے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

فرعون نے عروس کی گردن پکڑ کر اُسے زمین پر گرا دیا۔ اور بلند آواز سے خادموں کو بلایا
چند خادم وہاں آگئے۔ فرعون کے اشارے سے انھوں نے عروس کے کھوٹے ٹکڑے اُڑا
دیئے۔ بعد وہاں کھڑی رہی اور اس ہولناک منظر کو نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھتی رہی۔
جب خادم پہلے گئے تو اس نے فرعون کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ میرا بیٹا انتظار کر رہا تھا۔

اُسے معبودِ روح کے محافظ! میں نے تمام واقعات سنا دیئے ہیں۔ میں نہیں چاہتی آگے کیا ہو سکے
(یہاں پہنچ کر اُٹھ گئی کہ بیان ختم کیا جاتا ہے۔ آگے کا بیان اس کے بیٹے ڈاکٹر کی زبان سے ہے)

(۱۱) دردناک انجام!

اُسے معبودِ روح کے محافظ! چونکہ میری ماں نے مجھ پر اختیار کیا تھا اور تیری خواہش ہوئی
کہ تھی، اس لئے میں بھی تیری آواز کو پورا کر دوں گا اور تجھے آخری واقعہ بھی سنا دوں گا۔ فرعون
کو زہر دیا گیا تھا، مگر کم مقدار میں، اور اس وقت اس پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ وہ لڑکا
نے نہ پورا کوہِ شراب کا ساغر اس کے لبوں سے چٹا لیا تھا، جس صبح یہ ہولناک واقعہ پیش آیا، اس
کے چند دن بعد ایک رات محل کے صحن میں عظیم الشان جشن منعقد تھا۔ میں فرعون کے پاس
کھڑا تھا۔ یہاں ایک اس کا سر چکرنے لگا اور جشن سے باہر نکل گیا، اور کہا کہ اس کی عیام موجودگی
کی خبر نہ ہوئی، جشن ہوتا رہا اور جو نئی عید یا کوئٹہ ملی۔ کہ فرعون جشن سے باہر چلا گیا ہے۔ اس
نے جشن بند کرنے کا حکم دیا۔ اور صحن سے باہر نکل آئی۔ میں اور میری ماں بھی اُس کے قریب تھے۔
فرعون کے سر چکرنے کی خبر سُن کر وہ بہت پریشاں معلوم ہوتی تھی۔ راستے میں ہیں
ایک خادم ملی۔ اس نے جیسا بتایا کہ فرعون تو غلے کی طرف گیا ہے، ہم تینوں تیزی سے

تہ خانے کی طرف مدعا نہ ہو گئے۔ وہاں پہنچی کر بہنے دیکھا کہ فرعون بلند آواز سے یورہا۔ یورہا! پکار رہا ہے۔ یورہا! تیزی سے اس کے پاس پہنچی، اور اس سے پٹ گئی۔
فرعون..... فرعون!! میں یہاں ہوں! اس کے لبوں سے نکلا۔

ایکایک ہمارے پیچھے سے میروں، اور دیوانائی ہاتھوں میں خنجر تے بہنے اُن کی طرف بچھٹے۔ میں محبت فرعون اور یورہا کے آگے کھڑا ہو گیا۔ تیزی سے ایک دیوانائی کے ہاتھ سے خنجر پھینک کر تیزی خنجر اس کے پیٹ میں بگڑ گیا۔ دیا۔ وہ لڑکھڑاکر گر پڑا۔ میں اکیلا تھا اور وہ دو۔ مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ اُن کے دلوں کو بچھا آ رہا۔ آخر وہ سر دیوانائی بھی گر پڑا۔ میروں نے ہنسے جوش اور تندہ کے ساتھ مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے سر جھکا لیا۔ میرے بازو پر کاری زخم آیا۔ میں نے تیزی سے اس پر وار کیا۔ میرا خنجر اس کے سینے کی طرف جا رہا تھا کہ ایک دم غرضتی درمیان میں آگئی اور خنجر اس کی پشت پر لگا وہ ہلکی سی چیخ مارا گر پڑا۔ اپنی محبوبہ کو مرنے دیکھ کر میروں کی آنکھوں میں آنسو اتر آیا۔ اس نے مجھ پر حملہ کیا۔ آخر اس کے سینے پر ایک ایسا زخم لگا، کہ وہ لڑکھڑاکر گر پڑا اور اس کے ساتھ میں بھی زخموں سے نہال ہوا گر پڑا۔ میری ماں، میری طرف بڑھنے لگی۔ مگر یورہا کی چیخ سن کر روک گئی۔ فرعون گر پڑا تھا اور تڑپ رہا تھا۔ میں نیم بے چوٹی کی حالت میں کھڑا تھا اور اُن کی برادر چہرہ زخموں سے بہ رہا تھا۔ مگر میں انھیں دیکھ رہا تھا۔ ان کی آوازیں بھی میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔

مجھے زہر دیا گیا ہے! فرعون نے روتے ہوئے کہا۔

فرعون! فرعون!! کھنٹی ہوئی یورہا اس سے پٹ گئی۔ فرعون کے حلق سے ہلکی سی آواز ہلکی مگر میں وہ آواز سن نہ سکا اور وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

میرے محبوب! میرے فرعون!! یورہا پھینک مار مار کر رہنے لگی۔ میری ماں نے اس کا

باز پکڑ کر اُسے اٹھایا۔

نیرا بیٹا بھی سر پٹکا ہے بیٹی! میری ماں نے تلکیں آواز میں کہا۔ میں تے کچھ کہت چلا
مگر فرط صفت سے ایسا ذکر سکا۔

آپ زندگی بے کار ہے..... آہ فرعون کو زہر میں نے دیا تھا..... ماں! میں نے خود پر
کتھا بیٹا ظلم کیا۔ ان ذلیل یونانیوں کا کہنا مان لیا۔ اب میں زندہ نہیں رہ سکتی.....!“

نیری زندگی بھی بیکار ہے! میری ماں نے کہا۔ تکلفت اس کی نظر کوٹھے میں کسی چیز پر
پڑی۔ وہ یسودہا کا ہاتھ پکڑ کر اس کی طرف لے گئی۔ میں لپٹے لپٹے بعد مشکل ذرا آگے بڑھا۔
اب میں اس قدر تندرست ہوں کہ جسم کو فتنہ بھر چٹائی نہیں دے سکتا تھا میری ماں نے
بھٹک کر کسی چیز کو اٹھایا۔

ہانا زندہ رہنا بے سود ہے!

ہاں! ماں!

جانتی ہوں اس میں کیا ہے؟ میری ماں نے اس سے پوچھا۔

ہاں..... میں جانتی ہوں..... مجھے..... مجھے سب کچھ یاد آ گیا ہے۔

یو قبا، خاموش ہو گئی۔

نیرا میری بیٹی

ماں!..... ماں!..

میں جانتا تھا کہ وہ زہر کھا رہی ہیں، اور میں نے آواز دینے کی سخت کوشش کی۔ مگر
بے سود۔ میں تو پہنے لگا، اور اسی کوشش میں بے ہوش ہو گیا۔ معلوم نہیں، کتنے گھنٹے
میں بے ہوش رہا۔ جب مجھے ہوش آیا۔ تو اٹھ کر دیکھا۔ مہمانے میں خوامیں اور خدام

میراں وہ پریشانی کھڑے تھے میری ماں اور یوڈو پا ایک سیاہ پردے کے پاس ٹوہ پڑی
 تھیں، اور قریب ہی سنگ مرمر کی صندوق تھی۔ آہ! یہ وہی صندوق تھی۔ جس میں سے
 میری ماں، اور یوڈو پاتے زہر لے کر کھایا تھا، اور یہ وہی صندوق تھی جس میں سے
 یوڈو پاکی حقیقی ماں نے زہر کھایا تھا۔ ! ۵

مستقبلِ دُخت

حبیبِ صدق شعار ————— !

میں نے اپنے گزشتہ خط میں جس صحرائی و آسانی کا ذکر کیا تھا اسے ابھی ابھی مکمل کر کے ارسال کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ اس طویلِ دو ماں کا مطالعہ تم پر غور و فکر کے لئے دروازے کھول دے گا۔

لہذا جانتا ہے کہ ظلم اور مظلومیت کا تصادم کئے ارض کے انہی حصوں میں وقوع ہو سکتا ہے۔ جہاں تمدنی ہے۔ تہذیب ہے اور تہذیب و تمدن کو اجاگر کرنے والا ذریعہ یعنی سرمایہ ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ تہذیب و تمدن کے ہنگامہ زار آغوش جس میں نظم و ضبطیت ————— انسانی زندگی کے دونوں تار یک اور جیسا تک پہلو پرورش پالتے ہیں۔ پرورش پاکر برہمنے اور پھیلتے ہیں۔ لیکن ویران صحرائی و معطل اس لعنت سے کیسے پاک میں کیوں کہ نہ قریبیاں دولت ہے۔ جس کی حیر منصفانہ تقسیم انسان کو فزونی پر مجبور کر دے۔ اور نہ یہاں جاہ و مرتبہ کی ہوس ہے۔ جس کی عمارت کچی ہوئی انسانی زندگی کے سینے پر کھڑی کی جاتی ہے۔ اس حقیقت کو حقیقت ثابت کرنے کے لئے ہمیشہ مار تار یوں کے لا تعداد اوراق پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ظلم اور مظلومیت کا تصادم صرف شہری دنیا ہی تک محدود نہیں اس کا وجود ہے آب و گیاہ زمین

پر بھی پایا جاتا ہے اور بعض اوقات تو تہذیب و تمدن سے نا آشناٹے محض ہستیاں ایسا ایسا ظلم کرتی ہیں اور انسانوں کو ایسے ایسے بے رحمانہ طریقوں سے ہلاک کرتی ہیں کہ شہر کے ظالم قریبی دل و دماغ بھی اُن کا ذکر سن کر کانپ اُٹھیں۔

اگر شہروں میں حصول مراتب کی جوس اور سوسائٹی کے نظام کی صحت گیری اور سرمائے کی سخت غیر منصفانہ تقسیم کے سامنے ہیں انسانیت کی لڑکیاں فوجی جاتی ہیں تو لڑکی و لڑکی صحرائے سینے پر بھی مذہبی ادبام کے سامنے ہیں انسانیت کی رنگیں کافی جاتی ہیں بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ ظلم و مظلومیت کے باب میں جو کچھ تہذیب و تمدن کی بلندیوں پر ہوتا ہے وہی وحشت و بربریت کی گود میں بھی ہوتا ہے۔ پھر جس طرح شہروں میں "حکیم سامری" توڑنے کے لئے کسی منہوئی کی ذمہ داری مقدر ہو جاتا ہے اسی طرح ان وحشت و دہشت کی پردوش کا ہوں یعنی صحرائوں میں بھی ظلم کا قاتل کر کے کے لئے وحشی انسان ہی ہیں سے ایک وحشی میدانی محل میں کود پڑتا ہے اور اپنے مقصد پر اپنا سب کچھ ٹا ویں ہے۔ یہ داستان میرے اس بیان کی تصدیق کرے گی اور یقیناً نہیں بھی اس کی صداقت کا قائل ہونا پڑے گا۔

آج کل میں دی واد کا بیشتر حصہ خانہ بدوشوں کے یہاں گزرتا ہوں، یہ لوگ غیر معین مدت کے لئے یہاں رہیں گے، کیونکہ زمین کا بدیر ہی حصہ انھیں ہے۔

مجبور کا مختصر ذکر میں نے اپنے گزشتہ خط میں کیا تھا۔ یہ شخص خانہ بدوشوں کے سردار کا چھوٹا بھائی ہے اور کچھ سے چند دن میں اتنا بے تکلف ہو گیا ہے جتنا ہر دم۔ مجبور بلا کا نام میں سچا ہر چیز، ہر واقعہ، ہر حود و خوس کرتا ہے اور بعض اوقات اپنے انفرادی مشاہدے سے جو نتائج اخذ کرتا ہے وہ غاریب ایک غصہ کار اور بدیر لڑکی کی پیدل اور معلوم ہوتے ہیں۔ وہ بھر تو ہم تیوں یعنی میں، آغا ہرام اور مجبور شہزاد اور شہزاد کے اندر دیکھتے رہتے ہیں اور

جب شام کی تاریکی پھیلنے لگتی ہے تو بنجر کے خیمے میں چلے جاتے ہیں۔ پھر نصف رات تک اور بعض اوقات صبح کا ذب تک طرح طرح کی باتیں جوتی رہتی ہیں۔ رخت بدوشوں کا سردار بھی بڑا غبار آدمی ہے۔ اور وہ بھی ہماری گفتگو میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیتا رہتا ہے۔

میرا معمول ہے کہ ہر رات کم از کم ایک داستان ضرور سنایا ہوں اور چونکہ ایک مہینے سے ان خانہ بدوشوں کے یہاں زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اس لئے اب تک کم دیشیں تھیں داستانیں سن چکا ہوں۔ ان داستانوں میں زیادہ تعداد ان واقعات کی ہے جو صرف حسن و عشق کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کے سوا ان میں اور کچھ بھی نہیں۔ میں نے ان تین داستانوں میں سے صرف پانچ منتخب کی ہیں جو دنیا و نفاقا بھیجتا رہوں گا۔

یہاں میں یہ بھی یادوں کہ بنجر ذات خود عشق کی پُر غار وادی سے گزر چکا ہے اور اس اولو العزمی اور عالی ہمتی کے ساتھ گزر چکا ہے کہ جب تم اس کی داستانِ حیات سنو گے تو عشق عشق کر اٹھو گے۔

میرے لفظ فکر سے غلو میں اور قربانی ہی محبت کا دوسرا نام ہے۔ اور اس فوجیان نے محبت سے ملے جو قربانیاں کی ہیں وہ ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ بنجر کا افسانہ جلد سے جلد تمہارے پاس پہنچ جائے۔ مگر ابھی یہ افسانہ مکمل نہیں ہوا۔ مجھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے سینے کی گرائیوں میں محبت کی آگ ملک رہی ہے۔ اور محبت کی آگ اگر شعلتی رہے تو تمام عمر شعلتی رہتی ہے مگر جب شعلوں میں تبدیلی ہو جائے اس وقت انسان دیوانہ ہو جاتا ہے۔

میں نے بنجر کو بہت پاکیزہ خلعت انسان پایا ہے۔ لیکن اپنے بھائی کی حیثیت حاصل کرنے کے لئے اس کا دل بھی کبھی کبھی بے چین ہو جاتا ہے۔ خیر، ایک عام انسانی

کمزوری ہے اور کمزوری کو سنا نا واقعی سیرتِ انسانی کی بلندی ہے۔

دوست: میرے پیارے!! آج میں تمہیں ایک ایسی بات سنانے والا ہوں جسے پڑھ کر تم چند لمحوں کے لئے اپنی آنکھوں پر اعتبار کھودو گے۔

سو ————— !

خانہ بدوشوں کی دنیا میں ایک اونچی اونچی چٹانوں والی لڑکی اور مردھروں کی بھرتی فخر آتی ہے۔ اس دلنواز ہستی کی ہر ادا نے میرے دل پر خاص اثر کیا ہے۔ — اور کہ رہتی ہے۔ تم کو گئے آج صحرانورد نے محبت کی دنیا میں قدم رکھ دیا ہے۔ (اگرچہ یہ تجربہ میرے لئے نیا نہیں) مگر میں تمہیں یقینی دلاتا ہوں کہ میرا قدم اس دنیا میں آگے نہیں بڑھے گا یہیں رہے گا۔ مجھے ابھی دنیا کے گوشے گوشے میں جاننا ہے، بہت کچھ دیکھنا ہے، بہت کچھ سیکھنا ہے اور محبت کی امیری اس روم میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوگی۔ کیوں دوست ہے نا؟

دوست: مجھے اپنے دل پر پورا اہم تھا ہے اور میری یہ خدا اعتمادی کسی چیز کو بھی فرض کے راستے میں عاریل نہیں دیکھ سکتی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جب تک یہاں رہوں گا۔ اس لڑکی سے گفتگو کرتا رہوں گا۔ آخر گفتگو میں کیا ہر ج ہے؟

مجھے تم سے ایک شکوہ ہے۔ میں گوناگوں رکہ دلوں کے باوجود تمہیں تحریری طور پر یاد کرتا رہتا ہوں۔ مگر تم اس قدر تساہلی کیش ہو کہ دماغ کے مطالعے کے بعد ایک خط بھی نہیں بھیج سکتے۔ حالانکہ تم یہ کام بڑی آسانی کے ساتھ کر سکتے ہو۔ میں کبھی کبھی یہ بھی پانچتا ہوں کہ ہر ایک دماغ کے متعلق تمہارا نقطہ نظر معلوم کروں۔ امید ہے تم اس سلسلے میں خلعت سے کام نہیں لو گے۔ پس اب رخصت ————— !

تمہارا
صحرا انوری

(۱)

بوجھل رات ایک زنجی صاحب کی طرح جو بڑی وقت سے زمین پر گئے، رہا ہو۔
اندھیرے کی سیڑھیوں پر آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی پہلی چارہبی تھی۔ فندہ بیٹا میں
نخنہ نئے سارے کانپ کانپ کوڑا ہنی رہی وہی زنجی کا خزانہ ٹانگہ تاریکی کے غار
میں غائب ہو رہے تھے۔ اور ایک گھسٹے میں زرد زرد خونت زدہ چاند خور کو بلول
کے ایک ٹکڑے کے سینے میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

• ایک ایک مقدس درخت، راشے کے نیچے ناقوس کی آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی
نیم حریاں زنجی انسان جو تین تین ہار چار کی ٹوئیاں بنا کر غلٹاسی میں اور مراد مر بکھرے
ہوئے تھے۔ اپنے ہاتھوں میں جلتی ہوئی جھاڑیاں اور لکڑیاں لے اُچھلتے کودتے آگاتے
بجائے آمدنی کی سی تیزی کے ساتھ راشے کی طرف بڑھنے لگے اور کچھ دیر کے بعد درخت
کے اوپر اس طرح دھواں بھا گیا گویا درخت کی شاخیں دھواں اُگل رہی ہیں۔

جیسے جیسے ناقوس کی آواز دم ہوتی چارہبی تھی، صحرائی باشندوں کا شور بھی کم ہوتا
جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب مقدس درخت کے بجاری، ہونٹنی نے ناقوس دیکر اپنا دایاں
ہاتھ اوپر اٹھایا اور اپنی آنکھیں بند کر کے آہستہ آہستہ کچھ بڑھنے لگا۔ تسکوت وجود
کا عالم طاری ہو گیا۔ تمام لوگوں کے سر ذرا حقیقت سے بھجک گئے۔ اور انھوں نے کس
بات کا بھی خیال نہ کیا کہ جلتی ہوئی لکڑیوں کی آگ ان کے ہاتھوں کے بالکل توجہ ہی میں ہے
یا کچھ نہیں ہے۔

صحرائی لوگ اس درخت کو غنوں اور خوشیوں کا تقسیم کرنے والا سمجھتے تھے۔ چنانچہ

میں وہ تھی کہ وہ سال ڈیڑھ سال میں ایک مرتبہ ہر دس کے گرد اکٹھے ہو کر اپنی بھینٹ اور ذابرواری کا ثبوت دینے کے لئے ایک سین اور جوان لڑکی کو اس پر قربان کر دیتے تھے۔ اس قربانی کے بعد مجھ سے تھے کہ دیتا ان پر پہلے سے بڑھ کر مہربان ہو گیا ہے۔ یہ رسم مدت مدید سے جاری تھی اور اب تک بے شمار جوان لڑکیوں کا مٹیرغ خونی اس درخت کے نیچے پر کر سیاہ زمین کو سیراب کر چکا تھا۔ جب کسی لڑکی کی آغوشہ بخون نقش خاک پر تر پنے لگتی اس وقت قربانی کے قبول ہو جانے کی خوشی میں ایک بہت بڑا جشن منایا جاتا۔ جہاں میں ہر شخص کو حق حاصل تھا کہ جس طرح بھی چاہے اپنے دل کو خوش کرے۔ جس طرح چاہے خوشی منائے۔ اور آج بھی یہ لوگ اپنی زندگی کا اہم ترین فرض ادا کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔

اب دیرنا کے حضور میں قربانی کے پیش کرنے کا وقت آپہنچا تھا۔ اس لئے جن لوگوں کی کمریاں بالکل جل چکی تھیں۔ وہ خاموشی کے ساتھ جی بھاریاں یا مکڑیاں جلا ہلا کر انگوٹوں میں پکڑنے لگے تھے۔ اور جی لوگوں کو اپنے عزیزوں کا انتظار تھا وہ اضطراب کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔

اسی اثنا میں ایک جھوڑی کے عقب سے ایک شعلہ نمودار ہوا اور دوسرے لمحے میں ایک پست قد بزدل نا انسان جھاڑی کے پاس روتا ہو گیا۔ تمام لوگ اسے دیکھ کر ہنس پڑے۔ اور ہند لوگ تو اس پر طرح طرح کے آوازے کئے گئے۔

یہ پست قد انسان قبیلے میں بد صورت ترین انسان سمجھا جاتا تھا مہر نہایت چھوٹا۔ بال سر کنڈوں کی طرح اٹھے ہوئے۔ ایک آنکھ چھوٹی سی بد نما اور دوسری ایک بھانک گڑھ لاکھوں کے گرد بے لپے حلقے پڑے ہوئے، ناک چوڑی، صفت اور بھٹی پائیں

دختر پر ایک ڈراما سراپا داغ۔ جس نے چہرے کی بدصورتی میں خلصا اضافہ کر دیا تھا۔ واڑھی اور مونچھیں دونوں غائب۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ اکیس یا بیس برس کی ہوگی۔ مگر اس کے چہرے کی بھڑیاں دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس کی زندگی ساٹھ منز میں طے کر چکی ہے۔ اس کا نام تو راسم تھا مگر صحرائی لوگ اسے حقو کہتے تھے۔ ان کی زبان میں حقو کے معنی تھے ذلیل غیث ہستی۔ جس شخص کو اپنا غصہ اتارنا ہوتا۔ وہ تامل کے غیر فنو کہ پٹنے تھا۔ کیونکہ اس ذلیل غیث ہستی کا مقصد حیات اس کے سوا اندک کچھ بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی کمزوری کی وجہ سے ہر چھوٹے بڑے کی مار پیٹ، طعن و تشنیع برداشت کرے اور منہ سے آف تک نہ کرے، اور اب تک وہ اس فریق کو جس دختری کے ساتھ انجام دے رہا تھا۔

صحرائی لوگ قلعے پر تعلق رکھتے تھے کہ یکایک رابطے کے بغیر ہی نئے بلحاذا درجے کدہ شہر ہوا ہو بخدیٰ یعنی کوہنوں کی قربانی کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ قلعے بند ہو گئے۔ اور تمام لوگ مرد بار کھڑے ہو گئے۔ — رابطے کے سامنے پہنچنے والی حوریت عمارت آگے آئی اور پاروں میں گھسکر و ڈال کر ناچنے لگی۔

قریباً ایک گھنٹہ تک بجا رہی تھری تھی مختلف انداز سے۔ اسے کی ہر گہر توڑ کی غریب کرنا ہوا۔ پھر درخت کے تنے سے کھٹے ہوئے ایک لمبے سے کھماڑے کے چیل پر دائیں بائیں کی انگلیاں رکھ کر کہتی ہوئی آواز میں دانا طلیتاہ تاہ یعنی تیرپانی کا دقت آپہنچا۔ جیسے ہی اس کی انگلیاں کھماڑے کے چیل سے علیحدہ ہو کر درخت کی ایک شاخ کو چھونے لگیں ہمارے عظیم و عظیم آدمی جن کے کندھوں پر کھماڑے اور پیچھے ہلکے تھے انگریز کے ساتھ فرد کی طرف بھاگنے لگے۔

عمارت کافی دیر تک جاہتی رہی۔ پھر لوگوں میں شامل ہو گئی۔

”غزوہِ واٹھے سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر اجماعیوں کی اوٹ میں ایک مضبوط جھنڈی تھی، جہاں لڑکی کرکٹ چڑھانے سے پیشتر نصف دات تک رکھا جاتا تھا۔“

کافی دیر گزر گئی۔ اور وہ چاندی کی لوث کر ڈالتے۔ ہر ایک شخص کے چہرے پر
اضطراب کی علامتیں نمودار ہو گئیں۔ کچھ دیر کے بعد ان لوگوں میں سے ایک شخص بھاگتا ہوا
آگیا۔ اور پچھاری کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ اور دم پھولا ہوا تھا۔
”مزمینہ وہاں نہیں ہے“

یہ الفاظ سنتے ہی تمام لوگوں پر ہلکی سی گر پڑی، مدتِ مدید سے باقاعدگی کے ساتھ
 ٹاسنے پھینکنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر آج تک کسی شے کی کڑکھی آنکھ کی جڑات
 نہ بھونکی تھی۔ بھاگنے کا سوال تو کسی کے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔

مگر آج —؟

وہجاری نے گرج کر بدھ چھا

تربیان کیسے؟

وہ فکروا میں نہیں ہے اور وہی محافظ قتل کر دئے گئے ہیں۔ ہم مزینہ کی تلاش میں دور تک بھاگتے رہے۔ وہی شخص بولا۔

ہماری نے کہا سانس لیا۔ غم اور غصے سے اس کا جسم کانپنے لگا۔ وہ تورو کی طرف چلنے لگا۔ لوگ بھی اس کے پیچھے قدم جمانے لگے۔ تورو پہنچتے ہی اس کے قدم ٹک گئے۔ اُن کے سامنے دو تیز بہرہ داروں کی کشیش زمیں پر پڑی تھیں۔

ہجاری جبر پٹری کے اندر داخل ہوا۔ اور قربانی کو تلاش کرنے لگا۔ وہاں کچھ کسی نہیں تھا صرف ایک گہری گھاس کے چند ٹکڑے سند میں تھے ایک طرف بھاگ ہی تھی۔

(۲)

مقدس راشے کی قربانی کارات کے ایک قلیل حصے میں اظہارِ عقیدہ پہرہ داروں کی بھونچکی میں ۔ اس حیرت ناک طریقے پر مفقود الخیر جو پانا ایک ایسا واقعہ تھا ۔ جو ان کی صحرائی زندگی کے کسی دور میں بھی رونما نہیں ہوا تھا۔ اور نہ رونما ہو سکتا تھا۔ وحشی قبیلے کا کوئی فرد ایسا نہیں تھا۔ جس کا دل راشے کی عظمت و جلال سے لرز نہ رہا ہو۔ ہر شخص کو پورا پورا یقین تھا کہ راشے کی رضا مندی اُسے زندگی بخشی ہے۔ اور راشے کا غضب تباہی و بربادی کا ہے۔ جب یہ حالت ہو تو پھر مزینہ کا بھاگ جانا یا کسی شخص کا مزینہ کو بھاگ کر لے جانا انتہائی حیرت انگیز اور انوس ناک حادثہ تھا۔ سب لگتے تھے فاسوس میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ایک طرف صحرائی قبیلے کے دونوں سردار اکٹھے بھاڑ بھاڑ کر خالی جھونپڑی کو دیکھ رہے تھے اور دوسری طرف بھاری کافلوں کی فٹنوں کو غضب آلود آنکھوں سے دیکھ رہا تھا باقی لوگ اس واقعے کے متعلق طرح طرح کی قیاس آمانیاں کر رہے تھے۔

وہ لوگ جو صحرا میں مزینہ کو چاروں طرف ڈھونڈ رہے تھے باب بھادی کے سامنے کھڑے تپ رہے تھے بھاری نے اپنا دایاں پاؤں نوہرے زمین پر ڈالا اور گرج کر کہا۔
”نہیں لائے اُسے؟“

”وہ کہیں بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔ کم ہو گئی ہے؟“ ایک شخص دولا۔

بھاری چپ چاپ راشے کی طرف چلنے لگا۔ تمام لوگوں نے بھی اس کی پیروی کی، کچھ دیر کے بعد تمام قبیلہ راشے کی قربان گاہ کے گرد جمع ہو گیا بھاری نے اپنا دایاں ہاتھ

کھانٹنے کے پھل پر رکھ دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ قربانی دی جائے۔

لڑکیوں کے حیران و ششدر مہروں پر مردنی چھا گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ گویا سکڑا ہوا موت کے عالم میں آخری سانس لے رہی ہیں۔ ایک جاں کش طویل مدت کے بعد نظریوں نے فیلے کی تمام جڑوں انگلیوں کو راسے کے نیچے ایک دائرے کی صورت میں بٹھا دیا۔ ہر لڑکی کے ہاتھ میں ایک جلتی ہوئی کڑی موجود تھی۔ اور ہر ایک چہرہ قرطخوت سے زور تھا۔ اب بھاری آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لڑکیوں کے دائرے میں آگھڑا ہوا لڑکیاں ہاتھ اٹھا کر اپنا نام پکارنے لگیں بھاری نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس طرح کھڑا ہو گیا۔ گویا سیاہ مٹی کا ایک بُت ایسا وہ ہے۔

تمام لڑکیاں ایک ایک بار اپنا نام پکار چکی تھیں۔ اور بھاری بدستور بُت بنا کھڑا تھا۔ تمام صوفائی خاموشی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ لڑکیاں دوبارہ اپنا اپنا نام پکارتے لگیں۔
 "نور" "باسم" "خونی" "نما" "نسلطی" "تاچی" "دورت"۔
 بھاری نے ایک دم اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اور دُور سے چیخ ماری۔ "ماتے علی"۔
 یعنی رکتے بخشش!

جس لڑکی نے اپنا نام دورت بتایا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے ڈیلے پھیل گئے۔ منہ کھٹکا کھٹا رہ گیا۔ جلتی ہوئی کڑی اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ ایک سردار نے اس نیم مرد لڑکی کو بازوؤں پر اٹھایا اور راسے کے نیچے لے جا کر بٹھا دیا۔

لڑکی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور موت کا انتظار کرنے لگی۔
 بھاری نے کھانڈے کی حرکت ہاتھ بڑھایا۔ ایک ایک قریب سے آتا آتا۔
 قریب اور سرم کھنڈر میں بچھے ہوئے ہیں۔

ہلانے دو گھنٹے کے بعد وہ لوگ جو مزینہ اور معمر کو کپڑے لگائے تھے، واپس آ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی مجمع دم بخود ہو گیا۔

قبیلہ کا سردار آگے بڑھا اور ہللا۔ ”ہم کھنڈ کے قریب پہنچے، لڑجھج کی آواز سنی دُرا“ اور بھاگے۔ جھاڑیوں کے پاس کوئی انسان ٹپ رہا تھا۔ سب سے پہلے میں ہاں پہنچا میں نے دیکھا کہ خنو سخت زخمی حالت میں پڑا ہے، اس کے بعد ہم کھنڈ میں گئے۔ وہاں مزینہ تھی نہ مکرمل!

اب دوسرا آدمی آگے بڑھا۔ اُس نے دم توڑتے ہوئے خنو کو زمین پر لٹا دیا۔ بھائی نے خنو پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر راشے کی تعریف کرنے لگا۔ ورت کی نعش کو سب معمول زمین کھود کر دفن کر دیا گیا۔ اس کے بعد جشن ہونے لگا۔ اور صبح تک ہوتا رہا۔

جب سورج طلوع ہوا، تو راشے کے نیچے سڑنے لگے جس و حرکت خنو کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

(۳)

رات نصف کے قریب گز رہی تھی۔ مقدس راشے کا بھاری اپنے ددڑوں ہاتھوں میں لمبی لمبی جلتی ہوئی لکڑیاں لئے درخت کے نیچے سر جھکائے کسی غیل میں غرق کھڑا تھا۔ اس کے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر جھاڑیوں کے ایک انہار کے پاس رفاہہ سمارت افسردگی کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ کبھی تودہ ناچتے ناچتے لکڑیوں کی کمر دور اور ضعیف روشنی سے اس تندہ دُور چلی جاتی۔ کہ معلوم ہوتا تاریکی میں ایک سایہ کانپ رہا ہے۔ اور کبھی اس دُور قریب آجاتی کہ اس کا افسردہ چہرہ صاف طور پر نظر آنے لگتا۔

شعلہ تیزی کے ساتھ نکل رہا تھا۔

’آپ کی لکڑی بچھ گئی۔۔۔ اور بھاری لالوں آپ کے لئے تراشے ہوئے۔‘

یہ کہہ کر عادت اندھیرے میں گم ہو گئی۔ یکایک ایک چمچ گر بجلی اسی طرح بھینتر کر ہجڑی ادھر چلائے۔ رقصہ ایک پُر عار لکڑی لئے ہوئے وہاں پہنچ گئی۔

’کیا ہوا؟‘

’کچھ نہیں‘ رقصہ ہنس پڑی۔ جب میں غنڈک نقش کے قریب پہنچی۔ تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میسرے پاؤں کو کھینچ رہا ہے۔ ایک گیدڑ ٹھانک رہا ہے۔‘

’گیدڑ۔۔۔ تم گیدڑ سے ڈر گئیں یا نقش سے؟‘

’میں کسی سے بھی نہیں ڈرتی۔ میں جانتی ہی نہیں کہ کیا چیز ہے۔ اس وقت کسی نے میرا پاؤں پکڑ لیا تھا۔ یہ اعتبار دیکھ کر ہل گئی۔ جیسا گیدڑ نے میرے پاؤں کو کاٹ کھا لیا ہے۔‘
رقصہ نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔ اس کا پاؤں لہو ہوا تھا۔

’خمارت! میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں اسات صاف بتاؤ تم جانتی ہو یا نہیں کہ بھاری سے کوئی بات پرشیدہ نہیں ہو سکتی۔‘

ہجڑا نے یہ کہہ کر دوسری لکڑی جلانی کا اور رقصہ کے بائیں قریب کھڑا ہو گیا۔

’میرے قبیلے میں تم سب سے زیادہ چالاک عورت ہو۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ مزینہ اور معمر کے درمیان کس قسم کے تعلقات پیدا ہو گئے تھے؟‘

’راشے نو! میں اس سوال کا کیا جواب دوں؟ وہ دونوں مقدس راشے کی عظمت سے غافل ہو گئے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ جہاں جائیں گے۔ راشے کے غضب کی آندھی ان کے ساتھ ساتھ چلائے گی۔‘

”کیجیے جب تم نے انہیں جھانکتے ہوئے دیکھا۔ تو ہمیں کہوں نہ تھا۔“ راسھے کا تہر خُشب
 ہمیں جھانک کر خاک سیاہ کر دئے گا۔

”راسھے مولا میں نے یہ بتایا تھا کہ وہ بھاگ رہے ہیں۔ اور۔۔۔۔۔“
 راقصہ کی آنکھیں سُرخ ہوئیں۔

”میں راسھے کے سایہ میں چھپا کرتی ہوں کہ جب تک انہیں تلاش نہیں کروں گی۔
 جہاں سے نہیں بیٹھوں گی۔“

بھاری کے دائیں ہاتھ کی کڑی بھی نفع کے قریب نہیں جلی تھی کہ اس نے مڑ پڑ
 جوش میں اُسے دھڑکھڑکایا۔۔۔۔۔ راقصہ نئی کڑی لاسھے کے ساتھ چلی گئی۔

بھاریوں کے انبار میں ہاتھ ڈال کر راقصہ نے ایک عمارت کی کڑی اٹھائی اور پھینک دی۔
 ”بھاگ بھاگ آواز گونجی۔“ عمارت با۔

یہ آواز بھاری کی تھی۔ عمارت بھاگ کر راسھے کے نیچے پہنچی۔ بھاری اب بیٹھا ہوا
 تھا اچھندھوں تک راقصہ کو کچھ بھی نہ نظر آیا۔ مگر جب اس نے جلتی ہوئی کڑی اٹھا کر
 دیکھا۔ بھاری کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

راقصہ جینتی ہوئی بھاگی۔ چھند منٹ کے بعد بے شمار لوگ بھاری کے گرد جمع
 ہو گئے۔ انھوں نے اس کے زخم کا جائزہ لیا۔ زخم بہت گہرا تھا۔ اور وہ خون زیادہ بہہ
 جانے کی وجہ سے بے جوش ہو چکا تھا۔

پہلے تو قربانی کا زلزلہ ہانا اور پھر مقدس راسھے کے بیٹھے رہنا۔۔۔۔۔ قبیلے کا ہر
 شخص کانپنے لگا۔ ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ مغرب راسھے کا قہر و غضب تمام قبیلے کو
 تباہ کر دے گا۔

بچہ کو مار دینے کے وقت سروائے رفاہ کے بھاری کے پاس اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس لئے قاتل کے متعلق اسی سے استفسار ہونے لگا۔

اس نے سب سے پہلے تمام باتوں کو دہرایا۔ پھر ایک سردار کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی۔

”میں نے اس کی صورت اندھیرے میں دیکھی تھی۔“

سردار نے زخمی بھاری کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”راشے۔“

مگر اس سے پیشتر کہ وہ قسم کھائے اس کا ہنم ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔

مقتول سردار کی طرف ایک رشکی تھی اسقہ۔ اس رشکی کو اپنے باپ سے اسقہ بہت تھی کہ تمام قبیلے میں عزت و شرف میں کر رہ گئی تھی۔

اسقہ اپنے باپ کے بے رحمانہ قتل پر روتے روتے بے ہوش سی ہو گئی۔

(۴)

کمل ایک دلی اور ایک رات سفر کرنے کے بعد محرم اور مزینہ ایک وحشے کے کنارے پہنچ گئے۔ ایک تو تھکاوٹ اور دوسرے بھوک پیاس کی شدت کا یہ حال کہ ٹھکڑ کرنے کی سکت بھی ان کے اندر خمیں تھی۔ پانی پینے کے بعد جب ان کے جوش ٹھکانے آئے تو محرم نے اپنی محبوبہ کا سر زانو پر رکھا اور پیار بھرے لہجے میں بولا۔

”مزینہ تھکاوٹ سے ہمارا بُرا حال ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ وہ لوگ تعاقب کر رہے ہوں گے۔ اگر ان میں سے کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو ہماری جان کی خیر نہیں!“

”تو تو ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔ مجھے ہر حال مرنا ہے۔ خواہ راشے کی بعینہٹ پٹھان جاؤں۔ یہ سرداروں کے تیغے میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ تم نے سخت

غصہ کی کہ پیرو داروں کو قتل کر کے بچے لے آئے۔

کیا کرتا، محبوبہ تھا۔۔۔۔۔ اندھا تھا۔۔۔۔۔ محبت اندھا کی دینی ہے؟

اب تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے!

انگر ہم اسی کے علاقہ میں چلے گئے۔ تو یقیناً ہمارا یہی حال ہوگا۔

محرّم! اب بھی وقت ہے پلٹو واپس چلیں۔

”نہیں! ہرگز نہیں۔ ہم ان ظالموں کے قریب بھی نہیں جائیں گے۔ زمین بہت وسیع

ہے۔ کسی گوشے میں جا کر راحت کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔ یہ لوگ ہمارا نشانہ تک بھی نہ پاسکیں گے۔

تک بھی نہ پائیں گے۔

مکھیا تھا نا خیالی ہے۔ انھوں نے ہمیں اس طرف بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا؟

مزینہ نے اپنا سراپہ خوب کے زائچہ سے جھٹاتے ہوئے کہا۔

”نہیں، ہم سب ان کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔“

تم نہیں جانتے۔۔۔ جب یہ کشتی میں داخل ہوئے تو غلو کہہ دو رکھڑا تھا۔

۱۰۔ مکروہ النساء کیا کر سکتا ہے؟ مسموم نہیں ہے۔

ظن تو قبیلے سے کہہ دے کہ اور وہ ہمارے پیچھے بھاگیں گے۔۔۔ جگہ بھاگ رہے

ہوں گے۔ اور میں جہاں بھی دیکھیں گے اچھاری لوٹیاں اڑا دیں گے۔ میری ماں بھلا

والہیں چلیں۔ بھاری تھیں معاف کر دے گا۔ آخر تم اس کے بیٹے ہو۔

پھر میں زندہ نہ کر کیا کروں گا — زندہ رہیں گے تو دونوں اندھری کے تر

دونوں — سید مرید آگے چلے۔

ہم لے کہاں؟

آگے — کافی دور — مزید، ایک مرتبہ میں پہلے بھی آچکا ہوں یوق کو جانتی ہو۔ اس نے ایک سردار کو قتل کر دیا تھا۔ اور پھر بھاگ گیا تھا۔ ہم نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ جب میں یہاں سے دور اس کے قریب پہنچا تو یہاں بیٹا ہڑاتھا اس نے مجھے دیکھ کر رحم طلب آواز میں کہا تھا۔

”تم مجھے قتل کر کے میرا سر آسانی کے ساتھ لے جا سکتے ہو۔ مگر کیا تم مجھے معاف نہیں کر دو گے؟“

اس وقت اس کا لہجہ اتنا درد ناک تھا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ اور وعدہ کر دیا کہ لوگوں سے کہہ دوں گا۔ یوق صحرا سے نکل کر کہیں چلا گیا ہے یا مر گیا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یوق اسی صحرا میں رہتا ہے۔ ہم اس کی جھونپڑی میں رہیں گے۔

یوق قبیلے کو خبر نہ دے گا۔

”میں اُسے اپنی جان کی ضرورت نہیں؟“

مزینہ اٹھ بیٹھی، سرم نے اُس کا ہاتھ پکڑا۔ ابد دونوں گرم ریت پر چلنے لگے۔

(۵)

دعا سے شام کی تاریکی میں کھنڈر کے قریب سے گزر رہی تھی کہ اس کے کانوں میں سسکیوں کی آواز آئی۔ اس کے قدم رگ گئے۔ اردوہ پلٹ کر کھنڈر کو دیکھنے لگی۔ اور پھر ادھر ادھر نظر دوڑاتے لگی۔ کسی طرف بھی کوئی سایہ موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے وہم پر سکرانی اور پھر جلدی جلدی قدم اٹھاتے لگی۔

ابھی اس نے چند ہی قدم اٹھائے ہوں گے۔ کہ پھر سسکیوں کی آواز آئے لگی۔

رقاصہ دیدار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ادا آواز کو مٹنے کی کوشش کرتے لگی۔
آواز بند ہو گئی۔

مگر اب رقصہ کے دل میں یقین پیدا ہو چکا تھا کہ اس کے قریب کوئی نہ کوئی ہستی
موجود ہے۔

اب بسکیوں کی بجائے رونے کی آواز آرہی تھی۔

وہ دیدار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگی دیدار کے آخری سوسے پر
پہنچ کر اُسے محسوس ہوا کہ یہ آواز اتنے سے آ رہی ہے۔ اُس نے شکات میں سے کھانک
کر اُبلد دیکھا اندر میں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ وہاں آخری گوشے میں ایک سایہ حرکت
کر رہا تھا۔ اُس نے وہاں پہنچ کر ماضی لوک کر اُبلد قدم رکھا، اور آہستہ آہستہ اس گوشے
میں پہنچ گئی۔

اب پانچ کی۔ دم روشنی میں اُس کے سامنے ایک عجیب منظر تھا۔

استہ اپنے مرحوم باپ کا کتا بھاسر اپنے زانو پر رکھے دار و قلم رو رہی تھی۔

رقاصہ کادل بھرا آیا، اُس نے چہا کہ مظلوم عورت کو تسلی دے کہ استہ بڑے جوش و
خروش کے عالم میں کہنے لگی،

میرے مقدس باپ! تیرے قاتل پر رائے کی لاکھ لاکھ لعنتیں۔ میرے باپ کو بے گناہ
چھوڑ دے، رائے کو ہرگز قتل نہیں کیا۔ ناچنے والی عورت نے تیرے ساتھ دشمنی کر کے
تجھے ہلاک کیا ہے۔ لیکن اب وہ بھی زندہ نہیں رہے گی میں تیرے قابلِ عزتِ مسمیہ ہاتھ
رک کر قسم کھاتی ہوں کہ جب تک سماعت کو قتل نہ کدالوں گی اپنے اکلوتے بچے کی صورت
نہیں دیکھوں گی۔ میرے باپ تیری بیٹی ہوئی آنکھیں انتقام پا جاتی ہیں اور میں انتقام لے کر

پھوڑوں کی۔ خواہ اس میں میری زندگی ختم ہو جائے۔ میرا سب کچھ فٹ جائے۔
استہ پھر کہنے لگی۔

میرے مقدس باپ: میں صرف چند گھنٹوں میں تیرا اختتام لوں گی۔ میرا تیغ حمارت
کے جسم کی لٹائی کوئی اڑا دے گا۔۔۔ اس وقت تو کس قدر خوش ہو گا؟
استہ نے فطرت حقیقت و محبت سے مجبور ہو کر اپنے ہونٹ اپنے مردہ باپ کی
پائیں انگوٹھ سے لگا دیئے۔

رقاصہ چپ چاپ یہ شعر دیکھتی رہی۔ اسے کبھی خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی زندگی
اتنے خطرے میں ہے۔ اس کے اور استہ کے درمیان کمری محبت تھی۔ اور دونوں کو ایک دوسرے
پر پورا پورا اعتماد تھا۔ اس لئے استہ کو اپنا ارادہ پورا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

بے اختیاری کے عالم میں حمارت نے اپنے سینے کے پاس چھپا ہوا خنجر نکالا اور دوسرے
ٹکے میں استہ کے منہ سے ایک خونخاک چیخ نکل کر فضا میں گم ہو گئی۔

مجھے قتل کرنا چاہتی تھی ملعون! رقصہ نے اپنا خنجر استہ کی پشت کے نکلنے دیکھا۔

حمارت!۔۔۔ تو۔۔۔ تڑپتی ہوئی عورت ہے کہ۔

ہاں میں ہوں بزدل لڑکی!

لیکن تو بھی زندہ نہیں رہے گی!

کہہ کر استہ کھڑی ہو گئی، اُس نے اپنے بڑے کردار حمارت کی لٹائی پکڑ لی، رقصہ کو یوں محسوس
ہوا جیسے اُس کی لٹائی پکڑنا مجبور ہو گئی ہے۔ اس نے ہلکے سے زور کے ساتھ استہ کو پیچھے ہٹا
استہ لڑکھڑاکر گر پڑی۔ حمارت باہر آئی اور بھاگنے لگی۔

(۶)

دوسرے دن دوپہر نے وقت سمرم کو کہیں جا کر یوق کی جھونپڑی لی، یوق جھونپڑی
میں نہیں تھا۔ اس نے سمرم سے اپنی جھوپہ کو قائلہ بھیج دیا۔ اور خود جھونپڑی سے کچھ دور
جا کر بیٹھ گیا۔

یوق نے جیسے ہی اپنی جھونپڑی کے پاس کسی انسا کی دیکھا اڑا ہونے کی تیار کر کے
اٹھا، اگر سمرم اسے جلدی سے واپس آنے کا اشارہ نہ کرتا تو وہ بہانہ کر کے مظلوم کس
پاشی پکا جاتا۔

جھونپڑی کے پاس پھر اس نے اپنے غصے کے ماتھ بڑی کشادہ دلی سے ملاقات کی۔
مگر جب اس کی دوستی مصیبت سُنی۔ تو خوف اور ڈر کے واسطے اُس کی تمام خوشی باقی نکال
سمرم نے اسے یقین دلایا کہ کوششوں کو اس کے یہاں پہنچنے کی قطعاً جبر نہیں ہے۔ اور نہ وہ اسے
تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اطمینان یہ بات سمجھا کر یوق کی جالی میں جان آئی۔

جھونپڑی کے اندر جا کر یوق سمرم کی جھوپہ کو بڑی حیرت سے دیکھنے لگا۔ گیارہ سال
سے اُس نے عورت کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس لئے اب عورت کو دیکھ کر وہ جتنی
سیرت کا اظہار کرتا کم تھا۔۔۔ !

مزید پہلے پہل تو اس کی چمکی چمکی آنکھوں کو دیکھ کر ڈر گئی۔ مگر جب سمرم نے اُسے
ہر طرح تسلی دی، اور یوق کو ایک نہایت صرفت انسا بتایا۔ تو اس نے خوشی خوشی
وہاں رہنا منظور کر لیا۔

اس طرح تینوں عہرم ہستیاں میں جھونپڑی میں زندگی بسر کرنے لگیں۔

ایک دن جبکہ صوب اور ثوبہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ یحییٰ گھبرا یا
 دھڑا اٹھ آیا اور آتے ہی کہنے لگا۔

آب یہاں رہتا خطرے سے خالی نہیں۔۔۔۔۔ دشمنوں کو ہماری اطلاع مل چکی
 ہے۔ اور وہ یہاں پہنچ چکے ہیں۔

سرم جانتا تھا کہ طویل عزت گزینی نے یحییٰ کو وہی انسانی بنا دیا ہے۔ اس نے
 اس نے ہنس کر کہا۔

”تو تم نے ان کا مقابلہ کر کے انہیں بھگا دیا ہوگا۔“

یہ ہنسی کی بات نہیں سرم۔۔۔۔۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک عورت کو
 دیکھ ہے۔

عورت یہاں؟

اُن میری آنکھوں نے مجھے دھوکا نہیں دیا ہے۔ میں نے اُسے دوبارہ دیکھا ہے۔
 پر سول جب میں صبح کے وقت جھونپڑی سے باہر نکلا۔ تو کوئی شخص مجھے دیکھ کر بھاگ گیا۔
 اُس وقت تو میں نے اُسے صرف دابھے پر محمول کیا۔ مگر رات کو تو یہ دابہ حقیقت میں
 بدل گیا۔ کج کتابوں وہ عورت ہے۔

کہاں کھڑی تھی وہ؟ ”مزید نہ بول چھا۔۔۔۔۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔
 نیلے کے پاس؟“

تو تم نے اُس کا تعاقب نہیں کیا؟ سرم نے پوچھا اس کے لیے میں غنیمت رنگ غائب تھا۔
 وہ فی الغر غائب ہو گئی۔ نہ معلوم کہاں چُپ گئی۔ تعاقب کیا کرتا؟

یحییٰ! اگر تم کہتے کہ کوئی مرد دیکھا ہے۔ تو ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت پیش آتی۔

مگر عورت — میں یہ بھی نہیں مان سکتا کہ کوئی عورت یہاں پہنچ سکتی ہے۔ کسی عورت کو کیا پٹری ہے کہ اپنے شوہر کی آغوش چھوڑ کر یہاں بھٹکتی پھرے؟ تم عورت کے بھوکے ہو، اور کئی بار کہہ چکے ہو۔ میرے لئے عورت لادو۔ اس لئے مگر یہاں واقعی عورت آگئی ہے۔ تو تمہیں مسرور ہونا چاہیے، نہ کہ خوفزدہ اتھاری آرزو پوری ہو گئی ہے۔

یہ کہہ کر سرم نے قہقہہ لگایا اور بوق بڑھاتا ہوا باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد مزینہ کھنے لگی۔

اب میں یہاں نہیں رہیں گے۔

نہیں؟ یہ شخص تو باطل وہی ہے۔ کوئی عورت دورت یہاں نہیں آ سکتی۔ یہ جھوٹا تو ایسی جگہ ہے کہ کسی کو اس کا نشان تک نہیں مل سکتا۔

مجھے کسی عورت کے آنے کا خطرہ نہیں۔ مزینہ نے جھونپڑی کے دروازے پر نظر ڈال کر کہا۔

تو خطرہ پھر کس کا ہے؟

نہ شخص مجھے ہر وقت گھور گھور کر دیکھتا رہتا ہے۔ اور جب یہ گھور کر دیکھتا ہے تو مجھیں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی مجھ سے جھٹ جائے گا میں اس سے ڈرتی ہوں۔

سرم نے بلند قہقہہ لگایا۔

یہ آدمی باطل بے فرو ہے۔ میں اُسے سختی سے منہ کر دوں گا کہ تمہاری طرف گھور گھور کر نہ دیکھے۔ اس پر بھی اگر وہ باز نہ آیا تو میں اُسے ہلاک کر دوں گا۔

مزینہ مٹھائی ہانگی۔ ۱

(۷)

صحرائی قبیلے میں یہ خبر کہ بھاری کو اپنی زندگی کی اُمید تھیں۔ اند مقدس راشے کے بچے نے بھاری کا حکم سُننے کے لئے رات دن باہر دھتا ہے، با دھر مر کے جھوٹوں کی طرح ہر طرف پھیل گئی تھی۔ تمام وحشی ہر روز بھاری کے گرد جمع ہو جاتے تاکہ شے بھاری کا نام معلوم کریں۔ مگر بھاری انھیں یہ کہہ کر مایوس کر دیتا کہ: ابھی تک راشے نے کوئی اطلاع نہیں دی۔

ایک دن اتنی تندہ اور خوفناک بادِ صحر چلی کہ وہ تین چھوٹے بیاں گر پڑیں اور ایک کُندہ بھی مر گیا۔ لوگوں نے یقین کر لیا کہ راشے نے غضب ناک ہو کر ہیں تباہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ کیونکہ پہلے در پہ اس کی سخت قہقہے کی گڑبگڑ ہے۔

اس وقت تمام صحرائی لوگ خوفزدہ ہو کر راشے کی پناہ مانگنے کے لئے درخت کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

بھاری نے ناقوس بھانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد لوگ کافی دیر تک سرخِ سر پہنچے۔ جب بھاری کا اشارہ پا کر کھڑے ہوئے۔ تو بھاری نے راشے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
تھے بھاری کا فیصلہ ہو گیا ہے۔

لوگ بھاری کے پاس پہنچنے کے لئے ایک دوسرے پر گرتے گئے۔

مجھے راشے نے بتایا ہے کہ اس کا بیٹا کون ہے؟

نہیں ہے ہمارا مالک؟ کئی لوگ پتہ لے۔

بھاری تھوڑی دیر تک کھانسیا رہا۔ پھر ہوا۔

راشے کا بھاری مرم ہے؟

”سرم“ — ہر شخص حیرت میں ڈوب گیا۔

سرم نے راشے کی توہین کی ہے۔ مگر راشے نے اُس کا تصور صحت کر دیا ہے یہ باتاشے نے مجھ بتا دی ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ملے اُسے اُسے اور راشے کا بھائی بنادو۔ — اُ

مگر وہ مجرم ہے! ایک سر دلائے گا۔

”تم کون ہو راشے کے معاملہ میں دخل دینے والے؟“ کاری نے غضباً کہہ کر کہا۔
 ”میں نے جو کچھ کہہ دیا ہے، راشے کا حکم ہے۔“
 تمام لوگ دم بخود رہ گئے۔

(۸)

مزید غنودگی کے عالم میں سوکھے ہونے لگا س کے اوپر لیٹی ہوئی تھی کہ متا ایک وہم سا اس کے ذہن و دماغ میں ریچنے لگا۔

”تو اس کا عجب بھرو پڑی میں تھا۔ اندر نہ یوں۔۔۔۔۔۔ اگر اس حالت میں کوئی دشمن آئے اور اسے اُٹھا کر لے جائے۔ تو وہ کیا کر سکتی ہے۔ اس کے اندر نہ تو کھپ مقاومت ہے اور نہ وہ کہیں چھپ سکتی ہے۔“

وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ اور دروازے کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

”سے ایک منڈ منڈ دھخت کی آہنی پر ایک گدہ بیٹا بڑ بھڑ بھڑا رہا تھا۔۔۔۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے گدہ نے ایک چیخ ماری۔ اور اُڑ گیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی مزید غنودہ ہو کر بے اختیاری کے عالم میں پیچھے ہٹ گئی۔“

دھخت کے میں نیچے ایک عورت کھڑی تھی۔ جو دایں طرف دیکھ رہی تھی۔
 مزید بے حس دھکت اُسے دیکھنے لگی۔ اس عورت کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ مزید

دل بے اختیار ہلکا ہوا کہ بھاگ جائے۔ مگر اب جھونپڑی کے دروازے سے باہر نکلنا سخت خطرناک تھا۔
اس عورت کے اٹھنے کوئی چیز تک رہی تھی — ایک خنجر
مزینہ بیچے ہوتی تھی — اور پیرلیٹ تھی۔

وہ عورت چند لمبے کھڑی دائیں طرف دیکھتی رہی — پھر مزینہ نے دیکھا کہ اس کے
پاؤں جھونپڑی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یکایک جھونپڑی میں ایک آواز گونجی۔
ذیل عورت تو کہاں بھاگ کر جاسکتی ہے؟

مزینہ سانپ کی طرح رنگتی ہوئی جھونپڑی کے آخری گوشے میں پہنچ گئی۔ یہاں
گھاس کے بیچے ایک سرداخ تھا۔ مزینہ گھاس اٹھانے لگی۔ اُسے عروس ہونکہ دھوئیں
سے اُس کا دم کھٹنے لگا ہے۔

(۹)

سرم نے ہٹنے کے کنارے پہنچ کر خون آلود ہاتھوں کو صاف کیا اور غیر ارادی طور
پر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

فضا میں دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ایک دوسرے کے پیچھے اڑتے چلتے جا
رہے تھے — وہ چند لمبے وہیں کھڑا رہا۔ پھر پتوں اور گھاس سے بندھی ہوئی ہرن
کی خرچنکال نعش کو اٹھایا اور جھونپڑی کی طرف چلنے لگا۔

بھونپڑی کے قریب پہنچتے ہی اس کی رگوں میں ہلکیاں سی دھڑکنے لگیں — اس
سے کچھ فاصلے پر جھونپڑی دھڑا دھڑا جل رہی تھی۔ اس نے ہرن کو زمین پر رکھ دیا۔ بے
تھکا بھاگ کر وہاں پہنچا۔ اور شعلوں میں پھلنگ لگا دی۔ مزینہ کو بلند آواز سے پکارا مگر
کوئی جواب نہ ملا۔ اسی اثنا میں ایک طرف ایک ہاتھ دکھائی دیا۔ سرم شعلوں کو چیر کر

پنہا، اود اٹھ کر اپنی طرف کھینچا۔ اود ایک دم توڑتی ہوئی عورت کو بازوؤں پر اٹھا کر شعلوں سے باہر نکل آیا۔

عورت کا منہ جھلس چکا تھا۔ سر کے بال نعت کے قریب جل چکے تھے۔ اس کے علاوہ بدنی کے اکثر حصوں پر جھلے پڑ چکے تھے۔

وہ بوجھ کو سر پر اٹھائے چٹھے کے پاس آیا۔ اور اسی عالم میں پانی کے اندر اُتر گیا۔ عورت کا چہرہ بالکل جھلس چکا تھا۔ اور آخری سانس لے رہی تھی۔ — سرم نے بچے جیسی سے اس کے ہاتھوں کو ہلایا، عورت نے اپنی زبان باہر نکالی، بولنے کی کوشش کی، مگر بدل نہ سکی۔ اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ سرم نے نعل لگا کر اسے پر رکھ دیا۔ اور غصہ جگانے حرکت کھڑا زندگی سے محروم جسم کو دیکھنے لگا۔

محبت نے اس کے سینے میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ وہ سب قرا۔ ہو کر اپنی محبوبہ سے لپٹ گیا۔ اور بلب بلب کر رونے لگا۔ جب طوفان اشک تھا تو اُس نے اپنے چہرے کو محبوبہ کے بھیا مک چہرے سے لگا دیا اور سوچنے لگا کہ اس بہتی کے لئے اس نے نام قبیلے کی دشمنی مول لی تھی اس، سستی کی خاطر زندگی کی خوشیاں اود دیکھ دینے والے مقدس راسخ کو خود پر ناراض کر لیا تھا۔ اور اسی بہتی کی محبت پر سرد وشر کی بازی لگادی تھی۔

اور اب یہ بہتی — !

وہ سب قرا ہو گیا۔ اُنھ کو کھڑا ہو گیا۔ پھر اپنی محبوبہ کے چہرے کو چٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ ایک ایک ایک خبہ کانٹے کی طرح اس نے سینے میں جمایا۔

یہ تو کوئی اود عورت ہے۔ — مزینہ کا دایاں کان ایک مامٹے میں اُڑ گیا تھا مگر اس عورت کے دونوں کان موجود ہیں۔ یہ مزینہ نہیں کوئی اور عورت ہے۔

اس کا دل قدمے ملے ہو گیا۔ اور وہ کافی دیر تک مردہ عورت کا چہرہ جھلکی باتھ کر دیکھتا رہا۔

اب اُس کے دل میں یقین پیدا ہو گیا کہ عزیزہ نہیں کوئی اور عورت ہے۔ مگر اس لمحے میں ایک خوفناک خیال نے اس کی تمام اُمیدوں کا گلا گھونٹ دیا۔
”نکلیں میری محبوبہ جلی تو نہیں گئی۔“

اُس خیال کے آتے ہی اُس نے اپنی عورت کا سر اپنے زانو سے چسایا اور نجا کا پتہ وہاں پہنچا۔

اب جھوٹری کے بجائے خاکستر کا ایک تودہ پڑا تھا۔

اس نے گرم گرم خاکستر پر پاؤں رکھ دیئے۔ اور اپنی محبوبہ کی نعش ٹٹولنے لگا۔
”گدھے سودا، لہجے کے تپتے ہوئے انذاروں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ !
اس کا دل پوری طرح مطمئن ہو گیا۔ کہ اس کی محبوبہ زندہ ہے۔

اس کے بعد وہ پھر چشمے کی طرف چلا۔ اس کی عدم موجودگی میں گدھوں کے خول کے خول نصف سے زائد نعش چٹ کر چٹکے تھے۔ اُس نے چاہا کہ ایک مرتبہ اور اس عورت کے چہرے کو لازماً دیکھے۔۔۔ مگر جب وہ نعش کے قریب پہنچا۔ تو دیکھا عورت کے چہرے پر جگہ جگہ سے ٹپٹیاں لگی ہوئی ہیں۔

گدھہ کسی نعش پر بیٹھیں اور پھر وہاں گوشت رہ جائے یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟“

وہ نعش سے دور ہو کر بیٹھ گیا۔ اور اپنے زخموں کو دیکھنے لگا۔ اندگاس سے سوزن بونچنے لگا۔ کافی دیر تک وہ اس کام میں مصروف رہا۔ اس نے یقین کر دیکھا۔ جو آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا جا رہا تھا۔

مہرم دوزخ اس کے قریب نہ تھا اور پہنچتے ہیں اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ یہ کیا معاملہ ہے۔۔۔ کہاں ہے مزینہ؟ مہرم سفید چھل
 یوق نے اس کے جواب میں کہا: ”بھرتی کیجئے بلی گئی؟“
 مہرم نے دوبارہ پتہ سوال کو دہرایا۔
 ”یہاں تھا ہی نہیں۔“

”سب تمہاری شرارت ہے۔۔۔ مزینہ کہاں ہے؟“ مہرم نے گرج کر کہا
 ”یوق کی گردی ٹوٹ گئی۔“

یوق انتہائی زور لگا کر گردی چھڑانے لگا مہرم نے جلد بولنے لگا ہاتھ سے خون
 مٹھنے لگا مگر اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔

یوق نے اس کی پیشانی پر زور سے گھونسا مارا اس پر مہرم نے ہلکی گردی کھینچا
 ”تاؤ مزینہ کہاں ہے؟“

یوق گردی چھڑانے لگا مہرم کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

آخر یوق نے اپنا ہاتھ اٹھایا جس کا مطلب تھا ”مجھے چھوڑ دو تمہارا سوال کا جواب دیتا ہوں۔“
 مہرم نے گرفت ہٹائی گردی۔ یوق بچ گیا اور بحث اپنے دونوں ہاتھ مہرم کی
 گردی کی طرف بڑھا۔ مہرم سے پھرتی سے اس کی گردی کو پکڑ لیا اور اس وقت
 پھوٹا جب وہ مردہ ہو گیا۔

(۱۰)

اعلان ہوتے ہی تمام صحرائی لوگ بڑے جوش و خروش کے عالم میں مقدس درخت
 کے پاس آکر کھڑے ہو گئے پھر ان تمام افراد نے ہوشیاری میں اپنی طرف سے کچھ جلاتے تھے۔

نئے بھاری کے انتخاب اور مرحوم بھاری کی وصیت کے متعلق گزشتہ تجربات کی روشنی میں
لیچے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ مرحوم بھاری مقدس راسخے کو بہت عزیز
تھا۔ اور اس نے تمام عمر قبیلے کی خدمت کی تھی اس لئے اسکی وصیت پر عمل کرنا از حد ضروری تھا
مگر اب سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ مہرم کہیں غائب ہو گیا تھا۔ اور کسی شخص
کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے ؟

جب یہ لوگ منتشر ہو گئے ۔ تو چند تیز رفتار جوان مہرم کی تلاش میں روانہ
ہو گئے۔ ان فوجیوں کے علاوہ باقی لوگوں کو بھی حکم دے دیا گیا کہ مہرم کو جہاں کہیں
دیکھیں بعداً احترام سرا دہوں کے پاس لے آئیں۔

شام کے قریب جب تمام لوگ اپنی اپنی جھونپڑوں میں چلے گئے تو عمارت ماشے
کی ایک شاخ پکڑ کر سوچنے لگی۔ ایک ایک اس کی آنکھیں پکٹنے لگیں۔ اور وہ اندھیرے
میں تیز قدم اٹھانے لگی۔

کھنڈر کے قریب پہنچتے ہی اس کے دل میں ایک وہم سایدا ہو گیا۔ اس
رفتہ تیز ہو گئی ۔ اور ابھی کھنڈر سے کچھ ہی دور گئی ہو گی کہ اس کے
کالہ میں آواز آئی۔

عمارت! ٹھہر جاؤ!

عمارت کے قدم ٹک گئے۔ چند منٹ میں شکل بدلتا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

عمارت! میں نے تجھے آواز پر آواز دی!

تم زندہ ہو۔۔۔؟

میں مر گیا تھا زخمی مزدور ہوا تھا۔ دیکھو میری بیٹی!

خفیہ اپنے پیچھے دکھائی، ایک گہرے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔
 نیچے پر بھی زخم ہے اور سر میں بھی زخم — میں تو زخموں سے بھر پور ہوں جیسا
 وہ سردار کو ہلاک کرتے وقت لوگوں نے میری نعش پر دو تین وار کر دیئے تھے۔
 اگر انھیں معلوم ہو جائے کہ — تو تمہاری موتی بھی نظر آئے۔ سخت کان ہوتے
 نہیں دوسروں کی طرح مرنا نہیں چاہتا — کوئی بہت بڑا کام کر کے مرنا چاہتا ہوں۔
 عمارت چننے لگی۔

اُس تم کہاں جا رہی ہو۔ صاف صاف بتا دو — انھیں ڈھونڈنے کا
 رہی ہونا؟ — وہ کہاں ہیں دوڑاؤ؟

مجھے کیا معلوم — ڈھونڈنے جا رہی ہوں۔

تمارت! میرے سامنے کبھی بھوٹ — اس وقت تمام صحرائیں میں ہی تھیں
 راز داں ہوں۔ اور تم میری بہراؤ — یہیں ایک دوسرے پر اعتماد کرنا چاہیے
 ایک دوسرے کی مدد کرنا چاہیے۔
 کس قسم کی مدد؟

تم سمجھتی ہو میں صرف ایک مکہ ہونا ہوں؟

تو اور کیا ہو؟ عمارت نے مسکرا کر کہا

میں تمہیں ہر طرح کی مدد دے سکتا ہوں۔ یاد ہے تم نے اس دن اسی کھنڈر میں اپنی
 دھنیں بے محاذ کیا تھا تم سمجھتی ہو گی وہ مرچکی ہے۔ حالانکہ وہ مردہ نہیں ہے۔

تو اور کیا ہے؟

وہ زندہ ہے اور تمہارا تعاقب کر رہی ہے۔

حارث پھر سوچنے لگی۔

تم نے اس دن اپنی دشمنی رزمی سے وار کیا تھا۔ یہ تہذیبی کمزوری تھی۔ اگر میرے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو میں اُسے ہلاک کر دیتا۔۔۔۔۔ وہ تمہارے جانے کی قیامتیں دیر بعد کھلنے سے نکل گئی تھی۔

حارث بغیر کچھ کے چلنے لگی۔ اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

(۱۱)

جب سرم چشمے کے کنارے پہنچا تو شام کی تاریکی بھیل چکی تھی۔ اور ارد گرد کی چیزیں اس تاریکی میں غائب ہو رہی تھیں۔

وہ ایک جگہ ٹیٹ گیا۔ اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اسی اثنا میں اس نے چشمے سے کچھ دور ایک سائے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا وہ بھاگ کر وہاں پہنچا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ البتہ کوئی چیز اس کے پاؤں کے قریب تھی۔ گندہ رہی تھی۔ اس نے جھک کر دیکھا ایک گیند پتھر کو جھپٹے۔ نہ ہمارا تھا۔

اپنی آرزو کو اس طرح خاک میں ملاتے دیکھ کر سرم کھای تو مند تو میراں غضبک ہو گیا۔ اس نے چپے سے گیند پر مار کیا۔ ایک بیچ بند ہوئی۔ اور پھر غریب یاد دے لے لڑنے لگے۔

وہ آگے قدم اٹھانے لگا۔ دفعہ ایک جھاڑی کے پاس ایک سایہ اُٹھ رہا۔ وہ سرم بھاگا۔ سایہ بھی بھاگنے لگا۔ گنجان جھاڑیوں کے پاس سچے کر سایہ غائب ہو گیا۔

سرم کے ہاتھ زخمی تھے۔ اب وہ ان زخمی ہاتھوں سے نادراد جھاڑیوں کو ہٹا کر آگے بڑھے۔ اگلیساں تک کہ کھڑی جھاڑی سے پاس۔ یہ بھی گند گیا۔ وہاں وہ میراں بھاگا۔ تھا کہ دائیں طرف سے آگاز آئی۔

تو ہے ؟ سرم ؟
 سرم کی باجھیں کھل گئیں اور دائیں طرف جھگٹے لگا۔
 آواز دوبارہ آئی۔ سرم ! سرم !
 سرم بہت آگے بڑھ گیا۔ وہ مڑا۔ اور اس کی طرف بھاگنے لگا۔ جس طرف سے
 آواز آئی تھی۔

تو ہے۔ مزینہ میری !
 ہاں — میں یہاں ہوں ! ادھر آؤ۔
 اب پانچ کی مدھم روشنی میں، سرم کے پہلو میں مزینہ کھڑی تھی۔
 تم — مزینہ زندہ ہو؟ سرم کے منہ سے نکلا۔
 مزینہ کے تختے پھولے ہوئے تھے — اور وہ سرم کو آگئیں بھاڑ
 پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔

یہ تو نے مجھے چھپا دیا تھا؟
 تمہیں ہرگز نہیں — میں خود حیران ہوں کہ اب تک زندہ کیونکر ہوں؟
 بھونپڑی کو سب آگ لگی۔ اُس وقت تم کہاں تھیں؟
 بھونپڑی کو آگ لگی تھی؟ مزینہ نے حیرت سے کہا۔
 ہاں — وہ جیل کو راکھ ہو چکی ہے — بلکہ اب تو اس کی راکھ بھی وہاں
 نہیں ہو گی۔

عجیب ماجرا ہے — میں کچھ بھی نہیں جانتی — میں بھونپڑی میں تنہا لیٹی
 ہوئی تھی کہ وہ ایک عورت کو ہاتھ میں خنجر لے کر بھونپڑی کی طرف آئے ہوئے دیکھا،

میں نے مجھ لید دشمنوں کو باری اظہار مل چکی ہے۔ اس وقت جھونپڑی کے دروازے سے باہر نکل کر جاگنا سخت خطرناک تھا۔ اس نے میں جھونپڑی کے ایک گوشے میں جا کر لیٹ گئی۔ وہ عورت جھونپڑی میں آئی۔ اندکڑک کر بولی۔

”ذلیل عورت تو کہاں بھاگ کر جاسکتی ہے؟“

مجھے گھاس کے پیچھے راستہ مل گیا۔ اند میں دوڑنے لگی۔ اس نے بھی بتا دیا کہ جھونپڑی ہی میں دھوئیں سے میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ بھاگتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص میرا تعاقب کر رہا ہے۔ میں پوری تیزی کے ساتھ بھاگنے لگی۔ آخر تک کر اور پانچ سو چکران بھاڑیوں میں گھس کر یہاں پہنچ گئی۔ انداس طرح اپنے دوش سے محفوظ رہی۔ میں تمہیں ہر روز رات کے وقت ڈھونڈتی رہتی تھی۔ اب آج تم مل گئے ہو۔

مکرم نے غصے سے اپنی عجب کا چہرہ دیکھا اور پھر کہنے لگا۔

”میں جب جھونپڑی کے پاس پہنچا۔ تو وہ دھڑا دھڑا بل رہی تھی۔ میں آگ میں کود پڑا۔ اور ایک قریب الموت عورت کو آگ سے نکالا۔“

”ایک قریب الموت عورت؟“

”ہاں!“

”تھکا؟“

”معلوم نہیں“

”عجب راز ہے۔“

دونوں سوچنے لگے۔

(۱۲)

ایک صبح کو سرم اور مزینہ کسی بعید قریبی مقام پر پہنچنے کا ارادہ دل میں لے چلے عامرہ تھے۔ کہ فضا میں ایک ہنگامہ سا بپا ہو گیا۔ ابھی وہ اس ہنگامہ کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ سانسے عمارت مسکراتی ہوئی آئی۔

مزینہ کے چہرے کو رنگ بدل گیا۔ اس کے قدم ڈگ گئے۔ سرم بے خوف و خطر آگے بڑھنے لگا۔ عمارت کے قریب پہنچ کر اس نے دائرہ کرنے کے لئے تیز اٹھایا۔ عمارت دیکھ کر ہٹ گئی۔

راٹھے سر!

سرم حیرت سے سختی ہوئی صورت کو دیکھنے لگا۔

راٹھے سو! تم اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ہمارے مالک ہو۔
پھر شور بلند ہو گا۔ آنا قاتل کئی لوگ سرم اور مزینہ کے گرد ناچنے لگے۔
سرم بہت جا کھڑا تھا۔ اور مزینہ کی بھی مایہ کینیت تھی۔

شوہر تم گیا۔ قبیلے کے دونوں سردار آگے بڑھے، پہلے ایک سردار نے قبیلے کی رسم کے مطابق اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر کہہ۔

سرم اتنا مایا پ مرچکا ہے۔ اس کی وصیت ہے کہ میرے بعد میرا بیٹا بھاری جنت ہم اپنے بھاری کی بات کیوں کر رو کر سکتے ہیں؟ تم ہمارے مقدس سردار ہو۔
مقدس راٹھے کے بھاری ہوئے

اب دوسرے سردار نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر بھی الفاظ کہے۔

سرم کی مسرت کا یہ عالم تھا کہ اس کی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکلتا تھا۔ اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

”نہیں مقدس راشے کی خدمت کروں گا؟
تمام دگ اب کے گردنا پہنچے گئے۔“

(۱۳)

اب سرم مقدس راشے کا بھاری آیا دوسرے لفظوں میں اس کا قابل صدا استراٹم بیٹا بن گیا۔

جس دن یہ واقعہ ہوا اس دن صبح سویرے صبح سے لے کر رات کے ابتدائی لمحے تک ناچنا گانا رہا۔ سرم حیران تھا کہ ایک تو وہ وقت تھا کہ اسے اپنی جان بچانے کے لئے اللہ دندوں سے دور بھاگنا پڑا تھا۔ اور ایک وقت یہ ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ تمام لوگ غلط عقیدت سے اس کے سامنے بھجے کر رہے ہیں۔

ایک رات جبکہ صبحائی دستوں میں چاندنی بھیلی ہوئی تھی۔ اور سرم مقدس راشے کی پرستش کر رہا تھا۔ مزینہ اپنی بھونپڑی کے دواڑھے پر بیٹھی غلط مسرت میں مجرم جھوم کر ایک صبحائی گیت گا رہی تھی۔ اسی اثنا میں وہی کریمہ المنظرہ ناغوا آیا۔ اور صبح پاپ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

غٹو نے تہقہ لگایا۔ اور اس کے سر کے زخم سے خون ٹپک کر ایک لکیر کی صورت میں پیشانی سے گزرتا ہوا اس کی بھٹی ناک کے ایک کنارے پر پھینکا۔ اس چیز نے اس کی مکروہ صورت کو اور مکروہ بنا دیا۔

مزینہ نے منہ پھیر لیا۔ ہونا اس کے سامنے آ بیٹھا۔

یہاں تھا، اکیلا کام ہے؟ مزینہ نے غصے سے کہا۔

غصے نے جواب دینے کی بجائے قہقہہ لگایا۔ اور بغیر کسی وجہ کے اپنا سر ہلنے لگا۔

پتلے ہاؤ یہاں سے، ہنگے تمہاری کردہ اور ذلیل صورت سے سخت نفرت ہے؟

غصہ کا چہرہ گھبرا افسردہ ہو گیا۔ مگر افسردگی چند لمحوں کے لئے ہی قائم رہی اور پھر وہ ہو گئی۔

نیں تمہارا دل بھلائے آیا ہوں۔ تم سنا بیٹھی ہو۔

تم۔۔۔ تم میرا دل بھلاؤ گے؟ یہ کہتے ہوئے مزینہ ہنس پڑی۔

نیں دنیا کا سب سے کردہ انسان ہوں۔ غصے نے کہا۔ سن اس کے ہوشوں

کے پہنچ چکا تھا۔

تم انسان ہو۔۔۔؟

فرمیں کیا ہوں؟

تمہارے جیسا ذلیل صورت حیوان آج تک پیدا نہیں ہوا۔۔۔ تمہیں چاہیے کہ

فی الغیر اپنے آپکو ہلاک کر لو۔ یہ ذلت آمیز زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟

میرا زندگی ذلت انگیز ہے۔۔۔

ہاں۔۔۔ مر جاؤ۔۔۔ ہر شخص تم سے نفرت کرتا ہے؟

اُسی طرح مر جاؤں۔۔۔ ہے فائدہ؟

تمہاری زندگی سے کیا فائدہ۔۔۔؟ مزینہ ہنس پڑی۔

یہ تمہاری بھول ہے؟

مزینہ نے غصے سے ہونے کے مات ماری۔ یہاں دونوں ہاتھ ٹپک کر بیٹھا تھا۔ اس خطے

سے گر پڑا۔ اور وہ پھر کہنیاں ٹپک کر بیٹھ گیا۔ اور گھور گھور کر مزینہ کو دیکھنے لگا۔

مزینہ سوکھے ہوئے گھاس سے اپنے پاؤں سے لگے ہوئے خون کو پونچھنے لگی۔
 مزینہ تم میری زندگی سے نفرت کرتی ہو۔ کہتی ہو اپنے آپ کو ہلاک کر لو۔ مگر اس بات
 کو نہ جھوٹو کہ میں نے ہی تمہاری جان بچائی تھی۔ جانتی ہو کیونکہ — میں جانتا تھا کہ تم
 سمرم کے ساتھ لڑہ سے بھاگ رہی ہو۔ مگر میں خاموش رہا۔ سہارے نے قبیلے کو بتا دیا
 کہ تم کھنڈ میں ہو۔ میں اسی وقت کھنڈ میں پہنچا۔ لوگ ابھی آ رہے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ
 ابھی تم وہیں ہو۔ تو میں نے اپنے پیٹھ سے خود کو زخمی کر لیا۔ اور ایک طرف لیٹ کر کہنے
 لگا۔ لوگ آئے۔ تو میری طرف متوجہ ہو گئے۔ تمہیں بھل گئے کا موقع مل گیا۔

مزینہ کھڑی ہو گئی۔ اُس نے دوبارہ بڑے کے سر پر لات مار دی۔ بڑے کا زخم اور
 پھٹ گیا۔ وہ گر پڑا۔ پھر بیٹھ گیا۔

مزینہ بھلت دہاں سے چلی گئی۔

بڑے نے غصے کے عالم میں گھاس اکھیر ڈالا۔ اور پھر نامعلوم کس خیال میں ایک
 ایک تھکے کر ڈالنے لگا۔

(۱۴)

اس دن اتنی شدید تند اور خوفناک آندھی چلی کہ ہر ایک صحرائی باشندہ گھبرا کر اپنے اپنے
 محفوظ رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر آندھی تھی کہ بڑھتی ہی جاتی تھی۔

متعدد جھونپڑیاں گھر پڑیں۔ چند ننھے ننھے بانسوں کے نیچے دب کر مر گئے۔

نصف سے زائد صحرائی آبادی ایک مار میں جا چکی۔ اور باقی لوگ بھی اگلے دن
 ہاتھ رک کر اوندھے منہ زمین پر لیٹ گئے۔

سمرم اور مزینہ کی جھونپڑی سب سے مضبوط تھی۔ اس لئے اپنی جھونپڑی کے

ایک گرتے ہیں جہاں ایک دوسرے سے پیٹ کر بیٹھ گئے۔ ابھی اگلی دھڑ سے زور پر تھی کہ سرم کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی پشت پر زور سے ہاتھ مارا ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا اس کے پاس گرد و غبار میں آنا ہوا ہونا کھڑا اپنی آنکھوں کو نقل رہا تھا۔

خفہ سرم نے حیرت کے عالم میں کہا۔
 سرم! حمارت تے سرداروں سے کہا ہے کہ راشے ہم پر جاراض ہو گیا ہے، اور مارا
 ہو کہ ہم کو تباہ کر رہا ہے۔
 آں راشے غضب ناک ہے!

خمر حمارت نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ مزید اس کی قربانی تھی، اور وہ
 بھینٹ نہیں چڑھائی گئی۔

سرم سر سے لے کر باؤں تک کانپ گیا۔
 سردار اور تمام لوگ مزید کو بھینٹ چڑھانے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔
 جھوٹ بکت ہے۔ ذلیل خبیث بڑا۔ مزینے کہا۔ اور ایک بھاری لکڑی اٹھا کر
 اس کے سر پر دے ماری۔ راشے کی قسم، یہ جھوٹ کہتا ہے۔
 خنڈ کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

میں سچ کہتا ہوں، مجھے تمہاری قسم ہے!
 مقدس راشے کی قسم پر لعنت ہو، سرم نے کہا۔
 سرم، مزینہ بھاگ جاؤ۔ وہ خنڈ خنڈ درخت۔
 آہ۔ خنڈ خنڈ! سرم نے گھونٹنے کے ہاتھ پر مارا۔

نہ تو خوار و دخت ہے، بوسے نے اپنے پیچھے پڑوں کا تمام زور لگا کر کہا، اُس نے قہقہے کی جہ شار لڑکیوں کا خون ہلی لیا ہے۔

سرم نے اسے ہانڈوں پر اٹھایا۔ اور جھوپڑی کے باہر آکر اس طرح پھینک دیا جس طرح ایک وحشی انسان بجلی ہوٹی لکڑی کو جھنڈا کر پرے پھینک دیتا ہے۔
بوسے نے چلا کر کہا۔

بھاگ جاؤ۔۔۔

سرم نے نفرت سے اس پر تھوکا۔ اور جھوپڑی کے اندر چلا گیا۔
آندھی کچھ دیر قسم کر پھر شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔
خفا آٹھا۔۔۔ اس نے جھوپڑی کی طرف قدم اٹھایا۔۔۔ مگر لڑکھڑا کر گر پڑا۔

(۱۵)

دوسرے دن ہر ایک صحرائی کی زبان پر تھا کہ مزینہ مقدس راشے کی بھینٹ پڑ جائے
جائے گی۔ کیونکہ یہ اُس کی قربانی ہے۔

سرم اور مزینہ کے کافلوں میں بھی یہ خبر پہنچی۔ اب وہ بچھڑائے کہ کیوں نہ بھینے کی
بات پر اعتبار کر کے اسی وقت بھاگ گئے۔ اب نہ وہ بھاگ سکتے تھے اور نہ کسی
طرح اس آفت سے محفوظ ہو سکتے تھے۔

سرم نے اعلان کیا کہ مجھے مقدس راشے نے کہا ہے کہ مزینہ کو زندہ رکھا جائے اور اس
کی بجائے کسی اور کو قربانی کیا جائے۔ مگر قہقہے نے کہا کہ مزینہ ہی قربانی ہے۔ جب تک وہ
زندہ ہے۔ مقدس راشے ہم سے ناراض رہے گا۔

سرم نے یہ بھی کہا کہ ابھی قربانی کا وقت نہیں آیا۔ لیکن لوگوں نے جواب دیا۔ راشے

مزینہ کا خلع بدلنا گناہ ہے اگر ایسا نہ ہو تا۔ تو یہ غضب ناک آندھی کیوں پہنچی؟

چنانچہ اسی دن قبیلے نے مزینہ پر کڑی گزرا فی شروع کر دی۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں
بھیرے اور دوسرے ہاتھوں کی کھالوں سے باندھ دیئے تاکہ وہ حرکت بھی نہ کر سکے۔
یہی نہیں بلکہ کئی مسلح فوجوں اس کے گرد پہرہ دینے لگے۔

سرم نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اس کے گھوڑے کی کر رہ گیا۔
اسی شام عمارت تنہا گز رہی تھی۔ سرم نے اُسے ٹکایا۔ عمارت کی باجھیں کھل گئیں
وہ فورا سرم کے پاس آئی۔ سرم اٹھا۔ اور چپ چاپ چلنے لگا۔ عمارت بھی اس
کے پیچہ قدم اٹھانے لگی۔

کوئی دور جا کر سرم کھڑا ہو گیا۔ اور عمارت کا ہاتھ پکڑ لیا۔
کیوں سرم؟

سرم نے اس کے ہاتھ کو دھسے گھسیٹا۔ اور اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ عمارت
دھم سے زمین پر گر پڑی۔ اُس کے سینے سے خنجر کا ذل نکلا۔ اور وہ تر پنے لگی۔
ذلیل عورت! یہ ہے سزا تیری شرارت کی۔

عمار ت نے خنجر سینے سے نکالا۔ اور اپنے زخم پر ہاتھ رکھ دیا۔
سرم! تو نے مجھے ہلاک کر دیا۔ مگر میں تجھ پر لعنت نہیں بھیجوں گی۔ میں تجھے
حاصل نہیں کر سکی۔ لیکن کوئی اور عورت بھی تجھے حاصل نہیں کر سکتی۔
سرم خاموش کھڑا رہا۔

سرم اب میں تیرا کچھ نہیں بلکہ دوسکتی۔ میرے پاس بیٹھ جا۔ میں مر رہی ہوں۔
سرم اُس کے پاس بیٹھ گیا۔

نہیں جانتی تھی۔۔۔ اگر میری تجویز کامیاب نہ ہوئی۔ تو میرا یہی حال ہوگا۔ مگر میری تجویز کامیاب ہو گئی۔۔۔ پھر بھی دم توڑ رہی ہوں۔۔۔ سرم! تو جانتا تھا۔ میں تجھ سے محبت کرتی ہوں اور اس محبت کے لئے سب کچھ کر کر رہی ہوں گی۔ لیکن تھنے میری طرف تو مجھ نہ کی۔۔۔ خیر کوئی بات نہیں۔۔۔ میرے آخری سانس ہیں۔۔۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں۔۔۔ عمارت نے دوسرا ہاتھ بھی زخم بردار رکھ دیا۔

سرم! میں نے تجیلے کہ تمہاری فزاری کے متعلق بتایا تھا۔۔۔ میں نے ہی تعاقب کر کے تجھے دھونڈ نکالا تھا اور میں نے ہی اس جھوٹری کراگ لگادی تھی۔۔۔ تو سنے آگ لگائی تھی؟ سرم نے انتہائی حیرت سے کہا۔

اُن صبح میں نے دیکھا کہ مزید جھوٹری میں تھلے ہے۔ تو میں نے اُسے ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیا مگر ابھی جھوٹری میں داخل بھی نہ ہوئی تھی کہ میری نظر آستہ پر پڑی تو ادھر آ رہی تھی۔ وہ میری دشمن تھی۔ اور مجھے ہلاک کرنے کے لئے آ رہی تھی! میں ایک طرف ہٹ گئی۔ آستہ نے بجائیں جھوٹری کے اندر چل گئی ہیں وہ جھوٹری میں داخل ہو گئی۔

میرے ذہن میں ایک تجویز آئی کہ جھوٹری کراگ لگا دوں تاکہ دونوں دشمن ہلاک ہو جائیں۔ چنانچہ میں نے جھوٹری کو چاندوں طرف سے آگ لگادی اور خود دروازے پر کھڑی ہو گئی کہ کسی کو باہر نہ لکھنے دوں۔

جھوٹری دھڑا دھڑا چل رہی تھی کہ میری نظر تم پر پڑی۔ میں دروازے سے ہٹ کر ایک طرف چلنے لگی۔

سرم! میں کہتی تھی کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ مگر اس وقت میری نظر بجائیں ہوئی مزید بردہ پڑی۔ میں نے اس کا تعاقب کیا۔ لیکن وہ کہیں ٹھہر گئی۔۔۔ آخر

ایس ہر کر میں قبیلے میں — آگئی — اب میرے داغ میں ایک اور تجویز تھی —
 لیکن جب میں نے سنا کہ تمہارے باپ نے وصیت کی ہے کہ تمہیں بھاری بنایا جائے۔
 تو میں نے اس تجویز پر عمل کرنا مناسب سمجھا۔

اب قبیلے کے لوگ تمہارے دشمن نہیں تھے۔ اور نہ فریڈ کے دشمن تھے۔ میں نے
 لوگوں کو ساتھ لے کر تمہیں ڈھونڈ لیا۔

میرا ارادہ تھا کہ قربانی کا جب وقت آئے تو مشہور کردوں گا کہ فریڈ اسے قربانی
 ہے لوگ اسے بھینٹ پڑھا دیں گے۔ یا دیکھو بھوپڑیوں کو آگ لگا دوں گی اور کہہ دوں گی
 کہ واسٹے خفا ہو کر سزا دے رہا ہے۔ اس کی قربانی زندہ ہے۔

اتفاقاً آج صبح چلنے لگی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور سرداروں سے یہ بات
 کہہ دی۔ وہ جھٹ مان گئے — اور سرم — سرم !! آؤ تو نے مجھے ہلاک
 کر دیا۔ میری اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔
 مارت ڈگ ڈگ کر ماس لینے لگی۔

سرم ! آخری بات — تمہیں کس نے — میں — یا کہ قربانی —
 سرداروں — میں نے ؟

مجھے یہ بات بڑے غصے سے بتائی تھی کہ مارت نے سرداروں کو مزید کی ہلاکت پر
 آمادہ کیا ہے — میں نے اس وقت اس کی بات پر اصرار نہ کیا اور اسے ہلاک کر دیا۔
 اُسے ہلاک کر دیا — سرم ! وہ — ہلاک ہونے — دلی منس
 — نہیں۔ وہ اس وقت بھی — مردہ تھا — جب — اس
 نے تمہارے باپ کو قتل کر دیا تھا ؟

’اُس ذلیل ہونے نے میرے۔‘
 اُن محرم! یہ ہونا — سخت خطرناک — یہ مقدس رشتے کو کچھ بھی
 نہیں بچتا — اور مزید سے —
 سمارت نے آخری ہنگامی لی۔ وہ اب مر چکی تھی۔

(۱۶)

شام کی سیاہی نہیں رہی تھی۔
 لوگ جلدی جلدی کھاپی روپے تھے۔ کئی نکل رات انھوں نے قربانی دے کر
 راتے کو خوش کرنا تھا۔
 بیکایک فضا میں ایک خود برپا ہو گیا۔ کہ ہونے غصے نے بھاری کو زخمی کر دیا۔ کچھ
 بھاگے بھاگے راتے کے نیچے پہنچے — اور یک نخت اُن کے بدن تھر تھر کانپنے لگے۔
 ہونا غور مقدس راتے کو کاٹ رہا تھا۔
 فضا میں اتنا بلند خود پیدا ہوا کہ کان پڑی آواز سنانی نہیں دیتی تھی۔
 چند آدمی ہتھیار لے کر اُدھر بھاگے — غور تیزی سے درخت کاٹنے لگا!
 درخت جھکتا جا رہا تھا۔
 ایک شخص نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کلہاڑا پھین لیا۔ غور
 درخت سے چمٹ گیا۔

ان لوگوں نے پورے زور سے اس کی پشت پر کلہاڑے مارے۔ مد کلہاڑوں
 کے پھل ہونے کی پشت کو چیرتے ہوئے درخت پر گئے — اس کا بقیہ صفحہ ہی
 کٹ گیا اور اسی لمحے میں مقدس راتے زمین پر پڑا تھا۔

(۱۷)

چند دن کے بعد۔۔۔۔۔!

راشے دھڑا دھڑا رہا تھا۔۔۔۔۔ صحرانِ توگ خوش ہو ہو کر اس کے گرد آج

رہے تھے۔۔۔۔۔ قبیلے کی لڑکیاں تو اس قدر مسرور تھیں کہ اُن کی مسرت کا

اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

درخت کی جڑ کے پاس گوشت کے چند ٹوٹے اب بھی نظر آ رہے تھے! ۛ

گوئی محبت

وہ دونوں نوجوان تھیں اور ظاہر ہے کہ جوانی کی بہار آفرینی ہر جوانی بیکھر کے خدو خال میں ایک خاص شگفتگی اور ایک خاص دلآویزی پیدا کر دیتی ہے۔۔۔۔۔ چنانچہ وہ دونوں حسین بھی تھیں۔ دونوں کے قد بھی قریباً یکساں تھے۔ دونوں کی عمروں میں بھی کوئی خاص فرق نہ تھا۔ ایک سولہ سال کے قریب ہوگی۔ اور دوسری ستر یا اٹھارہ کے قریب ہوگی۔ گھما س کے باوجود دونوں میں نمایاں تفاوت نہ تھی۔ ایک کو فطرتاً ہی حاصل تھا کہ وہ خوب چہنچہ اور ہر وقت ہنستی رہے۔ اور دوسری دنیا میں صرف اس غرض سے پیدا ہوئی تھی کہ وہ خواہ چہنچہ یا روئے لیکن دوسروں کو مزہ دہنٹے۔ ایک اشاروں میں احکام صادر کرتی تھی۔ اور دوسری ان احکام کی بے چوں و پیر تعمیل کر دیتی تھی اور سب سے بڑھ کر کہ ایک کی زبان اس کے منہ میں تھی اور دوسری کی زبان اس کے ہاتھوں کے اشاروں میں تھی۔ ایک کا نام تھا اندھا۔۔۔۔۔ کا ہڈی ایک مشہور فرم کے داماد ملک سیٹھ بڑی پرشاد کی اکلوتی لڑکی۔۔۔۔۔ دوسری اکلوتی تھی جیوتی۔۔۔۔۔ لیکن یہ نام ایک شخص بھی نہ جانتا تھا۔ آخر ایک گونگی لڑکی کا نام معلوم کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ جس طرح ہر شخص گونگی کے نام سے ناواقف شہداء اسی طرح وہ بھی نہیں پہانتی تھی کہ وہ کون خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے والدین کون تھے۔ اندھا نے دو ایک بار اس کے خاندانی

حالات معلوم کرنے کی معہری کوشش کی۔ مگر جب دیکھا کہ اس سلسلے میں ہر کوشش
فعلی ہے۔ تو اس نے جانچی پڑتال کرنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔

کوئی ثبوت بھی خاص طور پر اپنی خادمہ کے خاندانی حالات معلوم کرنے کے لئے زیادہ
جگہ دو نہیں کرتی۔ پھر اندرا کو کیا پڑی تھی کہ وہ اپنی گنگی خادمہ کے حالات دریافت
کرسے؟ اس کے لئے یہی کافی تھا کہ اس کے گھر میں ایک گنگی لڑکی زندگی کے دن گزار
رہی ہے۔ جو اس کی خادمہ بھی ہے اور ایک قدیمہ تفریح بھی!

دو دن کی پہلی ملاقات عجیب امدان میں ہوئی تھی۔ —

ایک دن اندرا کالج سے واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ گلی کے ایک حصے میں چند
مرد تین اونٹ بچے کھڑے ہنس رہے ہیں۔ وہاں پہنچی، تو معلوم ہوا کہ ایک گنگی بھکاری بھوم
میں کھڑی گھبراہی ہے۔ جب اندرا نے گنگی کے متعلق کچھ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ
اس کے والدین بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ اندرا اب وہ اپنے دور کے ایک رشتہ دار کے دار
ساتھ بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالنے پر مجبور ہے۔ — یہ دور کا رشتہ دار
ایک بوڑھا تھا۔ جو اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔

اندرا نے بوڑھے سے کہا کہ وہ کسی دن گنگی کو اس کے مکان پر لائے وہ گنگی سے
باتیں کرنا چاہتی ہے۔

بوڑھا پاگل تھا جو اس زبیر صوفیہ سے خاوند اٹھا تا؟ وہ دوسرے ہی دن گنگی کو
سیٹھ بدری پرشاد کے عایشان مکان پر لے آیا۔
چند لمحوں کے بعد گھر کے لوگ اس کے ارد گرد کھڑے تھے۔

اب تو گنگی ہے کہ کمرے کی ہر ایک چیز کو بڑی حیرت سے دیکھ رہی ہے اور لوگ کہ

اس کی ہر حرکت سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اندر تو اس کی حرکات سے اس قدر محفوظ ہوئی کہ اس نے بوڑھے سے کہہ دیا۔

اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو گونگی کو یہیں رہنے دو۔ اس کے تمام اعتراضات کی دستخطی ہم پر ہوگی۔ تمہارے گزارے کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ہرماہ دے دیا کریں گے۔

بوڑھے نے یہ بات بخوشی مان لی۔ اور گونگی اندر کے یہاں رہنے لگی۔

اسے وہاں رہتے ابھی چند ہی ماہ گزرے ہوں گے کہ گھر کی فضا سے بددی طرح مافوس ہو گئی۔ اب نہ تو اسے اشاروں کے ذریعے اپنے مافی الضمیر بتانے میں کوئی دقت محسوس ہوتی تھی۔ اور نہ گھر والوں کو اس کے اشاروں کا مفہوم سمجھنے میں کسی تکلیف کا سامت کرنا پڑتا تھا۔

گونگی میں جہاں اندر خوبیاں تھیں۔ وہاں یہ خصوصیت بھی تھی کہ وہ گھر کے ہر فرد کا دل و جان سے احترام کرتی تھی۔ یہ خرابی کسی اور خادمہ میں ہوتی تو گھر کے لوگ اس کی بہت قدر کرتے کہ نامعلوم کیا بات بتاتی کہ ان تمام خوبیوں کے باوجود گونگی کو — مرث گونگی ہی سمجھا جاتا تھا اور گونگی بگتے وقت سمجھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے اس کی مضحکہ خیز حرکات ہوتی تھیں، خوبیاں نہیں۔

آج کل اس کی خوبیوں سے کافی متاثر تھی۔ اور جب وہ اس سے باتیں کرتی تو سب کچھ بھول کر اسے محض ایک ذریعہ تفریح سمجھنے لگتی۔ تاہم گونگی کو اس بات کی کوئی شکایت نہ تھی۔۔۔۔۔ کوئی شکوہ نہ تھا۔

(۲)

عام تعلیم یافتہ اور روشن خیال امیرِ زادیوں کی طرح! ابتداً کو بھی فنونِ لطیفہ سے دلچسپی تھی۔ بالخصوص فنِ مصوری میں تو اس کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ کسی اعلیٰ پائے کی تصویر کے حصول میں اگر اسے بڑی سے بڑی رقم بھی صرف کرنا پڑتی - تو وہ ہے دریغ صرف کر دیتی - چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جب اُس نے اخبارات میں ایک شاندار نقاشی کا اعلان پڑھا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔۔۔۔۔ اخبارات میں جو اعلان شائع ہوا تھا اس میں دو جگہ تھا کہ فائنل گامہ میں جہاں مرحوم مصوروں کی تصویریں دکھائی جا رہی تھیں۔ وہاں پہلے کو ملک کے موجودہ مصوروں کے خاص کارناموں سے بھی روشناس کرانا پڑے گا۔

اس اعلان نے ابتداً کے دل و دماغ میں ایک پہچان برپا کر دیا۔ اور وہ بڑی سبوتاہی سے دھبر کے آخری پھٹنے کا انتظار کرنے لگی۔

خدا خدا کہ اس انتظار کی گھنٹی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ ابتداً فائنل گامہ کے پہلے ہی روز اپنی چند سہیلیوں اور گونگی کو ساتھ لے کر فائنل گامہ میں پہنچ گئی اور سب سے پہلے اس نے آرٹ گیلری ہی کی طرف قدم بڑھایا۔ اس کی سہیلیاں تو چند منٹ میں چھتہ تصویروں کا جائزہ لینے کے بعد کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ مگر ابتداً ہر تصویر کو ایسی دلچسپی اور ایسی محویت سے دیکھ رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا شام تک وہ کسی اور چیز کی طرف توجہ ہی نہیں کرے گی۔ بلکہ ایک اسے محسوس ہوا کہ وہ ان تمام تصویروں کو دیکھ چکی ہے۔ جو آرٹ گیلری میں موجود ہیں۔۔۔۔۔ ایک خاص صبرت کے انداز میں

اس نے آخری تصویر سے لگاؤ میں ہٹائیں اور اپنی سہیلیوں کے پاس آ بیٹھی۔

ابھی اسے بیٹھے ایک ہی منٹ گزرا ہوا کہ اس کی سہیلی بولی:

”تم تو خیر آرٹ کی ہو ہی بڑی دلدادہ۔ لیکن تمہاری گونگی آرٹ کی محبت میں تم سے بھی دو قدم آگے نکل گئی ہے۔“

اندھا حیرت سے اپنی سہیلی کو دیکھنے لگی۔ سہیلی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک کونے

میں لے گئی۔ اب اندھا نے دیکھا کہ گونگا بڑی دلچسپی سے ایک تصویر دیکھ رہی ہے۔

”کیوں نہ ہو؟ آخر عامہ کس کی ہے؟“ اس کی سہیلی بولی۔

اندھا نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ گونگی کے کندھے پر رکھ دیا۔ گونگی بیٹھی اور جس طرح

بجھنے جھٹکنے پر راج کی روشنی دم پر مارتی ہے اسی طرح اس کی آنکھوں کی روشنی غائب ہونے لگی۔

اندھا نے گونگی کے چہرے سے نظریں ہٹا کر تصویر کو دیکھا۔ ”اے یہ دیکھ کر اسے

حیرت بھی ہوتی اور مسترت بھی، کہ یہ تصویر گیلری کی بہترین تصویر ہے۔ ایسی تصویر اس نے

اپنی تمام عمر میں نہیں دیکھی تھی۔ وہ دل ہی دل میں گونگی کا شکریہ ادا کرنے لگی۔ کہ اس کی

دھڑ سے وہ ایسی کامیاب تصویر دیکھ رہی تھی۔ وہ وہ تو تینہ ہم خوشیوں تمام تصویریں دیکھ

کر واپس ہی جا رہی تھی۔

اس تصویر میں رنگوں کے نہایت دلآویز امتزاج سے دکھایا گیا تھا۔ کہ ایک اندھی

لڑکی ایک نوجوان کے پاؤں پر اس طرح گر پڑی ہے۔ کہ اس کی باہیں اپنے محبوب کی

ٹانگوں کے گود سائل ہو گئی ہیں۔

تصویر کے نیچے لکھا تھا: ”ایک راز کا انکشاف!“

اس تصویر نے اندھا کو بہت متاثر کیا تھا۔ اور وہ جاہتی تھی کہ مصوری کے اس

بے نظیر نمونے کو ہر وقت دیکھتی رہے۔۔۔۔۔ ہر گھڑی دیکھتی رہے۔ آخر اس نے
 نائٹلنگ، کے منتظم سے مصور کا نام اورد پتہ پوچھا اور مگر بداندہ ہو گئی۔
 ایک چھتے کے بعد ایک درجوان جس کے لباس سے عزیمت ٹھک وہی تھی اندر
 کے سامنے کھڑا تھا۔

”کیا آپ کا نام دیپک ہے۔ اور آپ ہی نے وہ تصویر بنائی ہے جس کا نام ہے
 ایک راز کا انکشاف“؟ اندر آنے پر چھا۔

”نہی ہاں! میرا ہی نام دیپک ہے۔ ذرا قہاری کا شکر گزار ہوں میں سمجھتا ہوں اس
 میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شخص نے بھی اس تصویر کو خریدنا تو
 ایک طرف رہا۔ اس کی تعریف میں بھی دو لفظ نہیں کہے۔ میں مایوس ہو چکا تھا۔ مگر اب یہ
 سمجھ کر کہ میرے آرٹ کے بھی قدردان موجود ہیں۔ میری ہمت بھنگ گئی ہے۔۔۔۔۔
 ناٹا آپ نے نائٹلنگ، کے منتظم سے تصویر خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا؟ مصور نے
 سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔

”ہاں میں اس تصویر کو خریدنا چاہتی ہوں۔ مگر منتظم سے نہیں خریدوں گی۔ اگر آپ
 اسے اپنی قیمتیں دیکھیں تو عرض کروں کہ یہ تصویر میں براہ راست مصور سے حاصل کرنے
 کا شرف حاصل کروں گی۔“

فرط مسرت سے مصور کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

”ہاں میں ایک بات اور پوچھنا چاہتی ہوں۔ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ کچھ نمبر
 مصور سے بڑی دلچسپی ہے۔ آج تک تصویروں کو فراہم کر کے اپنا شوق پورا کرتی
 رہی۔ اب میری آرزو ہے کہ خود بھی کاغذ کو داغدار بنانے کی کوشش کیا کروں۔۔۔۔۔

اور دیکھ دوں انہماں حیرت کرتے رہتے۔

گوئی کے سپرد گھر کے کئی کام کا چھتے۔ تاہم وہ دیکھ کی آگے سے پیشہ تمام فرائض سے عمدہ برآ جو کہ اندھا کے کمرے میں پہنچ جاتی اور جب تک دیکھ وہاں رہتا۔ جب چاہے کوچ پر بھیج دیتی۔

دیکھ کئی بندے سے ایک تصویر بنوا رہا تھا۔ اور اس تصویر کا موڈل بھی اندھا جب تصویر مکمل ہو گئی تو گونگی بھی اپنی تصویر کی آرزو کا اظہار کرنے لگی۔

گوئی کئی دن سے اپنی آرزو کا اظہار کر رہی تھی۔ جب دیکھ آتا تو وہ اس کے سامنے سٹول پر بیٹھ کر اس طرح خاموش ہو جاتی گراں موڈل ہے اس پر اندھا بھی ہنس پڑتی اور دیکھ بھی:

انہی دنوں چانک اندھا کی طبیعت طویل ہو گئی۔ اب دیکھ کا کام یہ تھا کہ وہ کسی جھٹے میں اندھا کے یہاں آئے۔ اور اس کی حالت دیکھ کر واپس چلا ہائے۔

جھوٹی ایک سڑت تواریات کے دو دو سبب تک اپنی مالک کی خبر گیری کرتی رہتی تھی اور دوسری طرف نامعلوم کیوں اس کی فطری شرمیلی غائب ہو جاتی یا وہی تھی۔ وہ اب بھی سنہتی تھی۔ گریہ آہستہ آہستہ کیسے معلوم ہوتی تھی۔ وہ اب بھی دیکھ کے ساتھ اناؤں میں باتیں کرتی تھی۔ لیکن ایک بھوک۔۔۔۔۔ ایک خاص جھک پٹ کے ساتھ!

بعض اوقات رات کو اندھا کی آنکھ کھٹکتی جاتی تھی تو وہ بھٹکتی تھی کہ جھوٹی کوچ پر بیٹھی فرش پر پڑی ہوئی انگلیٹھی کی چمکایوں کو ایک خاص حریت کے ساتھ دیکھ رہی ہے اس نے گوئی سے اس حریت کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی مگر ازل تو گوئی اپنی مالک کا منہم ہی نہیں سمجھ سکتی تھی مگر اگر بھٹکتی بھی تھی تو خدا سے کہ خاموش ہو جاتی تھی!

ایک دن ائمہ نے دیکھ لیا۔

شاید ہماری گونجی ہم سے ناراض ہے۔ دیکھئے تو آج کل کچھ خاموشی اور اندازہ سی رہتا ہے۔ اس کی تصویر بنا دیجئے نا!

نہیں اسی بات پر خفا ہو گئی ہے؟ دیپک نے نہیں کر کہا۔ اور دوسرے دن جب وہ آیا۔ تو حیرت کا ہاتھ پکڑ کر اسے ستول کی طرف لے گیا۔ جیوتی سمجھ گئی۔ اس کا انکھوں میں جھک سی پیدا ہو گئی۔ ایک ایسی جھک جو بکھیتی ہوئی ٹہنگا ری کے ایک دم روشن ہونے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں جھک دود ہو گئی۔ دیپک نے دیکھ کر گرنگی بصورتِ انکار اپنا سر اڑا رہی ہے۔ دیپک نے بہتیری کوشش کی کہ وہ ستول پر بیٹھی نہ پ۔ لیکن گرنگی اپنی ضد پر بدستور قائم رہی۔

افدا کہنے لگی۔۔۔۔۔ نیجاری کچھ روزے کر رہی تھی میری خواہش یہ تھی کہ
بنادو گھر آپ نے تو جہیز نہ کی۔۔۔۔۔ خاندان ہر ماں کا زائد کیا کرتی ہے؟

اتحاد نے یہ الفاظ بڑی ہمدردی سے کہے۔ ویسے یہ بڑا افسوس کی بات ہے کہ اس کی خوبصورت تصویر کا تو ذکر کیا۔ یہ خود بھی خوبصورت ہے۔ اگرچہ چاری کو گچی نہ ہوتی تو نامعلوم کتنی نکاح ہوں گا مرکز میں چلی جاتی۔

اقتضائے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

دوسرے دن جبروتی خاص طور پر افسردہ تھی۔ اندازے اسے خود مشکل پر بٹھا دیا۔
 ایک نعت گوئی کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ ابدہ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔
 جبروتی کی قصور رخنہ لگی۔

جب تک وہ سٹول پر بیٹھی رہتی تھی۔ ایسی حرکتیں کرتی رہتی تھی گویا بہت پریشان

”نہز اس کی بددینی کی وجہ کیا ہے؟“

”میں خود بھی نہیں جانتی۔۔۔۔۔۔! اللہ نے جواب دیا۔ جہوتی چلی گئی۔

”اللہ! اس کے دادا کو دھونڈو۔۔۔۔۔۔“ ”نہی ہے اس کی جدائی میں غم جو؟“

”دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔۔۔۔۔۔“ ”جہوتی دلچسپ گفت کر خیر ہی تھی اور اللہ بخیر“

”کے ماحی سے چرنا کھڑک رہی تھی!“

(۴)

گوئی سب بہت کوشش کی کہ اپنے دل سے اس خوفناک جذبہ کو نکال دے۔ جس

کا ہر لمحہ ہر لمحہ بکھرتا پھرتا جا رہا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس کا معصوم دل اور اس کا واضح

جہ زنجیروں میں جکڑ دیا گیا تھا۔ ان زنجیروں کو توڑنا اس کے لیے اس کی بات نہ تھی۔ وہ بات

کو بہتر بدلیتی تو دل میں حمد کر لیتی کہ اب صبح ہرگز اللہ کے کمرے میں نہیں جائے گی

۔۔۔۔۔۔ اب ہرگز دیہک کی صورت نہ دیکھے گی۔ مگر جب صبح جہوتی قریب جذبہ بے اختیار

اُسے کشاں کشاں اس شعلے جاتا۔ جہاں بجکتی جہوتی دو بڑی بڑی آنکھیں سے اس طرح

سمجھ کر لیتی۔ جس طرح سانپ کی آنکھیں پرندے کو سمجھ کر لیتی ہیں۔ اس کا ہر بار وہ دم

توڑ دیتا۔ اس وقت اس کی حالت اس پرندے کی سی ہو جاتی۔ جس کے پر شکستہ ہوں اور

جوانمائی بے چارگی کے عالم میں دود و دھند کی ایک شاخ پر اپنے اُٹھانے کو ابھرتا رہا۔

اس کی زبان گرہی تھی مگر دل توڑکا نہیں تھا۔ اور اس کے دل کی زبان اس کی گونگی

زبان سے نہ معلوم کیا کچھ کہتی رہتی تھی۔ لیکن جیسے ہی وہ اپنے خواہشات جہادگر کے

سامنے آتی آئیں بائیں آئے سوا اس کی زبان سے کچھ بھی نہ نکلتا۔

دیہک ہنس پڑتا اور گوئی کے پیچھے کا شعلہ اب بھی بہرنگ آٹھتا۔

جے جے عزیز تھی۔

کئی اور چلتے گزر گئے۔۔۔۔۔ اب کوئی کاجوئی ایک تصویر میں منتقل ہو چکا تھا۔
تصویر میں دیپک کھڑا تھا۔ اور جیوتی اس کے پاؤں پر اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ اس
کی دونوں بائیں دیپک کی ٹانگوں کے گرد سائے ہو گئی تھیں۔

کوئی نے اپنے کمرے سے پرنگا ہیں ڈالیں اور خود بخود شرمندہ ہو گئی۔

کوئی کا کام ختم ہو چکا تھا لیکن ابھی اس کا مقصد پورا نہیں ہو سکا تھا۔ دیپک اپنے
شہر میں تھا اور جیوتی اس کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔

دیپک آگیا۔ اسے دیکھتے ہی کوئی کا دل دھڑکنے لگا۔۔۔۔۔ وہ اپنی خواہش

میں پھل گئی۔۔۔۔۔ اس نے تصویر اٹھائی اور بھاگ کر باغیچے میں جا کھڑی ہوئی۔

کافی وقت گزر گیا اور ابھی دیپک کمرے ہی میں تھا۔

جیوتی نے تصویر کو پتہ سے کے سامنے رکھ دیا۔ اور خود اندر کے کمرے کی طرف
آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگی۔

ایک دو منٹ کے بعد وہ اندر کے کمرے کی دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے

کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھا اور دیکھا کہ اس کی آنکھوں کے تلے اور حیرا پھا گیا۔

اتحاد اور دیپک۔۔۔۔۔ دیپک اور اتحاد۔۔۔۔۔ دیپک کے بازو اتحاد کی

گود میں سما گئی اور اتحاد کے ہاتھ دیپک کے پیچھے پڑا۔

کوئی ایک لمحہ کے لئے بھی وہاں کھڑی نہ رہ سکی۔۔۔۔۔ باغیچے کی طرف جانے

لگی اور پتہ سے کے قریب پہنچ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر فشر کی طرح ایک خیال اس کے دل

میں بھاگا۔ اس نے تصویر نکالی اور اسے پتہ سے پتہ سے کر کے ہوا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔

دیپکت آیا۔۔۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ گرگی نے اسے دیکھا اور اس طرح کھڑی ہو گئی۔ جیسے پتھر کی بے جان سورتی ہو۔
دیپکت کا غم کے پردوں پر قدم دکھتا ہوا چلا گیا۔

(۶)

مجھے چہرے ہزاروں ہیں سے ایک دم نئی نکال دینے سے چراغ کی جو کیفیت ہوتی ہے۔
وہی کیفیت حیاتی کی ہوتی۔ اس کی تمام اُپدیں تمام آرزوئیں خاک میں ملی گئی تھیں۔ اس کے من کا دیپکت بجھ چکا تھا۔ تاہم اس نے اپنی تمام تر قوجات گھر کے کاموں پر مرکوز کر دیں۔ وہ صبح سے لے کر شام تک ایک شین کی طرح کام کرتی تھی۔ اور جاہتی تھی کہ ہر وقت کام کرتی رہے۔

آہستہ آہستہ اس کی طبیعت میں کچھ تبدیلی سی پیدا ہونے لگی۔
اندرا کی ملگنی دیپکت سے ہو گئی۔ اور چند روز کے بعد شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔
جیوتی ایک دنا دار خادمہ کی طرح شادی کی تیاریوں میں حصہ لینے لگی۔
ایک دن اندرا اور دیپکت اس رخصت میں غمک ہو گئے جس رخصت کو دنیا شاہی کا کہتی ہے۔ چونکہ دیپکت ایک غریب بھوتہ تھا اس لئے سینہ بدلی پر شاہی نے اپنی بیٹی اور داماد کو اپنے جگھ میں رہنے کی مہازت دے دی۔

اندرا گرگی کو اپنے لئے بہت بڑا ذریعہ تفویج سمجھتی تھی۔ اس لئے وہ گرگی کو بھی اپنے ساتھ لے جانے لگی۔

گرگی نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ مگر اندرا کے سامنے اس کے انکار کی کیا حقیقت تھی۔

نہیں ہستیاں شہر کے باہر ایک شاندار دھکے میں چلی گئیں۔

(۷)

کچھ دھکے لئے مگر گئی کی طبیعت میں سکون پیدا ہو گیا تھا۔ مگر یہ سکون سمندر کے اُس سکون کی مانند تھا۔ جو ایک قیامت خیز اور خوفناک طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کا دل ہر وقت بے چین رہتا تھا۔ اور اس کا دماغ ہر لمحہ ایک کھٹکشی میں گرفتار۔ وہ کوشش کرتی کہ یہ بے چینی دور ہو جائے اس کے دماغ کو اس کھٹکشی سے نجات مل جائے۔ لیکن نہ تو وہ بے چینی دور ہوتی اور نہ کھٹکشی سے نجات ملتی۔

کام کرتے وقت یا دل کو کھاتے وقت وہ کھ لیتی کہ اس کے دل کا زخم پیشہ کئے مندل ہو گیا ہے۔ مگر جیسے ہی اس زخم میں ایک ٹیس اٹھتی، وہ پریشان ہو جاتی۔ اور یہ پریشانی اس کے زخم میں نشتر سا چھو کہ زخم کو اور گرا کر دیتی۔

ایک دن اس نے گھر سے بھاگ جانے کا ارادہ کر لیا۔ وہ یہ ارادہ لے کر دروازے تک گئی۔ اچانک دیکھتے ہی اس کا ہر وہ نظر آگیا اور وہ اس طرح لوٹ آئی جس طرح دریا کی لہر ساحل پر پڑے ہوئی کسی چیز کو بہا کر لے جائے۔ دُور۔ اور دُور!

اس کے دل میں ہر وقت جذبہ محبت اور جذبہ نفرت کے درمیان ایک کھٹکشی سی جاری رہتی تھی۔ کبھی تو محبت کا کثیف بادل محبت کی آگ پر اس طرح چھا جاتا کہ جوتی لپٹے چہرے پر اتھ دیکھ لیتی اور بھاگ بھاگے پر تیار ہو جاتی۔ اور کبھی یہ آگ اس طرح سیر تک اُٹھتی کہ خوف کا بادل اس کے شعلوں پر دھڑکیں کی مار ایک سی جھانک رہا ہوتا۔

کب تک ضبط کرتی۔ اضطراب اور بے چینی کی جھلکیں اُٹھیں اور اس کا سکون و ضبط شکنوں کی طرح بہا کر لے گئیں۔

جب کبھی وہ کمرے میں تنہا ہوتی اور کہتی کہ بالکل دوسرے کمرے میں کام کر رہا ہوں۔
تو دیپاک کی قیاس کر سنے سے لگا کر دوسرے سے بھیجے لگتی۔

ایک دن کمرے میں وہ اکیلے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے دیپاک کی تصویر چڑی تھی۔
بجھ وہ آکسو جری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے لڑتے ہوئے آنکھوں سے
خون کو اٹھایا اور اسے آنکھوں کے بہت قریب لے آئی۔

آنسوؤں نے اس کی آنکھوں پر اس طرح نقاب ڈال دی تھی کہ وہ اپنی بالکل
بھی نہ دیکھ سکی جو اس کی دائیں جانب کھڑی اس منفر کو سخت حیرت کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔
اتنا آج تک اس قدر حیران نہیں ہوئی تھی۔

وہ چپ چاپ کمرے سے لپکی گئی۔ اس کے دل میں کانٹا سا بھجھنے لگا۔ آؤ
یہ کیا ستا ہے؟ گوئی کو ہو کیا گیا ہے آج؟ پاگل ہو گئی ہے۔ پاگل۔ اُس نے
میرے خون کو کیوں نہیں دیکھا؟ خاص طور پر دیکھ کے خون کو کیوں دیکھ رہی ہے؟
اتنا اس دن شام تک انہی خیالات میں غرق رہی۔

ایک دن بارش جو رہی تھی۔ جیوتی کسی کام کی طرح سے محلے میں سے گزر رہی تھی
کہ اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اور وہ دھم سے زمین پر گر پڑی۔ دیپاک بھاگ کر اس کی طرف
گیا اور اسے سبے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر کمرے کی طرف لے جانے لگا۔

تبے چاری ہے ہوش ہو گئی ہے۔ دیپاک نے اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر کہا۔
بیوی نے دیکھا کہ گوئی کی باہنیں اس کے شوہر کی گردن میں مائل ہیں۔

نچا ہٹائی پر لٹا دیکھیے! اتنا لے ہیں ہمیں ہو کر کہا۔

ٹاؤں کیجیے؟ دیکھو تو بے چاری کا کیا حال ہے؟

پاس گئیں اور اُسے ہلاسنے لگیں۔ گرگی نے آنکھیں کھول دیں۔
 لڑکیوں نے اسے بستیہرا ہلا دیا لیکن وہ آنکھیں ملٹکی باندھ کر کھیتی رہی۔
 لڑکیاں اُسے گھوڑوں میں لے گئیں۔ شام کے وقت کہیں باکرہ گرگی نے انا سے کٹے
 گھروالوں نے کھالیا کہ بے چاری گرگی ہے۔ گرگی اب وہیں سمجھ گئی۔

(۹)

دیپک پر ایک خوفناک بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ جس نے اس کے ہمرے کی تمام
 خوبصورتی چھین لی۔ اب وہ چند قدم بھی چلتا تھا تو اس کی آنکھیں لڑکھڑکھنے لگتی تھیں۔
 اعتدا کو کبھی خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ اس کا حسین شوہر اس قدر بد صورت —
 اس درجہ کریمہ المنظر ہو جائے گا شدید بیماری نے دیپک کے مزاج میں پڑ چڑھ ہی بیٹا
 کر دیا تھا اندر چڑچڑاہی اعتدا کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ ہر روز ان دونوں
 میں گھرار ہوتی تھی۔ اسی طرح اعتدا کے دل گزور رہے تھے۔

دیپک کی رات تھی۔ اعتدا کا بچہ کھلونوں کے لئے مٹھ کر رہنے لگا۔ اعتدا اور دیپک
 دونوں بچے کو ساتھ لے کر بیچے سے نکل آئے۔ زمیندار کی لڑکیاں بھی گرگی
 کو ساتھ لے کر بازاروں میں گھوم رہی تھیں۔ گرگی اُن کے پیچھے پیچھے چیزیں اٹھائے
 چلی جا رہی تھی کہ اس کی نظر اعتدا پر پڑی۔ پھر اعتدا کے ہمرے سے ہٹ کر دیپک
 کے ہمرے پر۔۔۔۔!

حیرت سے اس کی آنکھوں کی پتلیاں بھیل گئیں۔

اس نے اپنی آنکھوں کو دو تین بار دکھایا۔ مگر اس کے سامنے دیپک ہی کھڑا تھا۔
 گرگی کے دل میں بیسیوں فشر جھوم گئے زمیندار کی لڑکیاں تو ہنستی ہوئی آگے نکل

گلیں اور انہیں گونگی کی اس دقت خبر لی۔ جب وہ ٹانگے کی پوٹ میں سرگزشتی ہو چکی تھی۔

(۱۰)

گوئی پہلے سے بڑھ کر بے تاب ہو گئی۔ اس کے دل کا زخم جس کی خونخیزی بند ہو گئی تھی۔ اب پھر پھٹ گیا تھا۔۔۔۔۔ اس کا محبوب شدید بیمار ہے۔ یہ خیال ایک لمحے کے لئے بھی اُسے نہ بھولتا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی بے قراری کم نہ ہوتی تھی۔ وہ کئی لمحے سے دیوانہ وار دیکھ کی تصویر بناتی تھی اور پھر اسے ماریتی تھی۔

ایک طوفانی رات تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جسم خراش ہوئے شور پیدا کرتے چہرے پہل رہے تھے۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھی۔ اُسے درد بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اس دقت اسے ہر شس آیا۔ جب وہ لالیٹن اٹھائے تیزی کے ساتھ ہلی جا رہی تھی۔

بارش۔۔۔۔۔ چھینٹے ہوئے تیز تند اور ہڈیوں میں شکست کرتے ہوئے ہوا کے جھوٹے۔۔۔۔۔ گوئی تیزی سے قدم اُٹھا رہی تھی۔

ایک جگہ وہ دم سے گر پڑی۔ اس کی ٹانگوں پر کئی زخم آئے۔۔۔۔۔ اور پاؤں خون آلود ہو گئے۔ مگر وہ ایک کراہ کے ساتھ پھراُٹھی اور زیادہ تیزی سے پہنچ گئی۔ آخر جھٹکے کے قریب پہنچ گئی۔

(۱۱)

دیکھت اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ وہ تنہا تھا اور شدید بیمار۔ میری ناراضی ہو کر یکے پہلی گئی تھی۔

یہ ایک اُس نے قدموں کی پاپ سنی۔ وہ بجلی کا نہیں رہا نے کے لئے اٹھا۔ ابھی اُس کا ہاتھیں تک نہیں پہنچا تھا کہ فرط ضعف سے گر پڑا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے

اُس کی ہڈیاں بیس دی گئی ہیں۔

فضا میں آں واں کی سی آوازیں آنے لگیں۔ دیکھ کے سر اٹھا کر دیکھا۔ بدھنی

اور پھر گولی کا چہرہ ——— !

جیوتی ——— ! دیکھتے نے حیرت سے کہا "تم یہاں جیوتی؟"

جیوتی آگے بڑھا آئی۔ اس نے لالٹیں کھڑکی کے قریب رکھ دی ——— دو تین

لمحے خاموشی ——— ساکت کھڑی رہی۔ اور پھر بے اختیار ہو کر اس نے دیکھتے کے ہاتھ پکڑ لئے۔

ہوا کے تھوڑے تھوڑے کھڑکی کھل گئی۔ لالٹیں دوسری طرف جا گری۔ کمرے میں

اندھیرا بھا گیا۔

بجلی چمکی ——— جیوتی نے اپنے محبوب کے چہرے کو دیکھا ——— اس کی ہڈی

بے ——— اور فضا میں ایک آواز پیدا ہوئی۔ "دی۔ پک۔"

دوسرے لمحے میں گولی کی ٹانگیں اور کھڑائیں اور دم سے گر پڑی۔

(۱۲)

صبح اندھا ہزاروں شکوے اور شکایتیں لئے ہوئے بچھے میں داخل ہوئی۔ اور جلدی

جلدی قدم اٹھاتی دیکھتے کے کمرے میں آگئی۔

وہاں پہنچتے ہی ——— حیرت سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

دیکھتے فرش پر پڑا تھا ——— جیوتی بھی گری پڑی تھی۔ اندھ اس کی

دونوں بائیں دیکھتے کی ٹانگوں کے گرد لپٹی ہوئی تھیں بے

اُن دا آ

چند ٹوٹی پھوٹی، بوسیدہ اور بدلتا جھوپڑیاں ——— چند بچے بُرائے کھڑوں
میں طبریں مفلوک الحال مگر ہشاش بشاش انسان، چند مریں، نحیف و نزار لیکن شبہ و دو
محنت کرنے والے گھسے ——— بیس کے قریب مٹی کے بڑے بڑے اور چھوٹے
چھوٹے قودے ——— اور درختوں کی ایک قطار کے قریب بہتی ہوئی شفات اور
تیز رفتاری ——— یہ تھی کل کائنات خدا داد بستی کی۔

خدا داد بستی کہنے کو تو ایک بستی تھی۔ مگر یہاں کوئی پختہ بھی ایسی نہیں تھی۔ جو عام
طور پر بستیوں میں پائی جاتی ہے۔ ——— باد جو دیکر یہاں تیس جا بیس انسان زندگی بسر
کر رہے تھے۔ لیکن علاقہ اس قدر بخر، اتنا دیرانی نظر آ رہا تھا کہ آس پاس کے گاؤں کا
گنوار سے گنوار شخص بھی یہاں رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ کئی مرتبہ دیہات کے لوگوں نے جاہک
اس دیرانے کو آبادی میں تبدیل کر دیں۔ چنانچہ وہ اس مقصد کے زیر اثر یہاں پہنچے تھے۔
چند دن تک ادھر ادھر گھوم کر مکان بنانے کے لئے زمین بھی تلاش کرتے رہے۔
اور چند آدمیوں نے باقاعدہ طور پر یہاں رہائش بھی اختیار کر لی۔ لیکن یہ تا شابت جلد ختم
ہو گیا۔ ——— دیہات کے جاہل اور گنوار لوگ بھی خدا داد بستی میں سانس لینے والے
انسانوں کو محض جنگلی اور صحراؤں ہی سمجھتے تھے۔ ان کے ذہن تمام کے تمام مہندم پہنچے

تھے۔ اور اب ان کی بکھائے اینٹوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ جنہیں خداوند بستی کے لئے
کبھی کبھی ہلکا کر دیکھ لیا کرتے تھے۔

خداوند بستی کے لوگوں کے لئے یہاں کی مٹی ہی سب کچھ تھی۔۔۔۔۔ مٹی جسے یہ
لوگ اپنے گودھوں پر لاد کر شہروں میں لے جاتے تھے۔ اور اس کے عوض آب و دانہ
لے آتے تھے!

عام طور پر مٹی کا ذکر صبح کے دھندلکے میں جاتے تھے۔ اور دن بیتیہ واپس
جاتے تھے۔۔۔۔۔ مرد گھر سے چلے جاتے تھے تو عورتیں بچہ بیٹی تھیں۔ کپڑے بیٹی
تھیں اور گھر کے دوسرے کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔

بنا ہر گودھوں پر مٹی لاد کر شہر میں جانا معمولی سا کام ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ
خاص قسم کی مٹی حاصل کرنے میں۔ جنہیں بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایسی
دشواریوں کا سامنا ہر عام شہری لوگ محسوس ہی نہیں کر سکتے!

بعض اوقات مٹی حاصل کرنے میں ان کے ہاڑوؤں اور کندلوں کو پورا پورا دھن
حرکت کرنا پڑتی تھی۔ جب کہیں جا کر وہ مٹی کی خاص مقدار حاصل ہوتی۔۔۔۔۔ اور پھر
یہ بھی بات ہے کہ شہر کے لوگ اتنی محنت و مشقت سے نکالی ہوئی مٹی کو۔۔۔۔۔
صرف مٹی ہی سمجھتے تھے۔ اور اسے چند سکوں کے عوض خریدنا بھی ان کے لئے ایک
تکلیف دہ امر تھا۔ ان کو کیا معلوم کہ اس مٹی کے لئے کتنے انسانوں نے کڑی محنت و مصوبہ
اپنا لہجہ دینے کا کرنا دیا ہے۔

خداوند بستی کے مرد کبھی محنتی ہتھ اور عورتیں بھی۔ مردوں کو جب کبھی فرصت ملتی۔
تو وہ ندی کے پار جا کر ایک بہرہ نمیزی کی طرح زمین کا جائزہ لیتے گئے۔ اور عورتوں کو

ان کے یہاں کافی گھسوں موجود رہتا تھا۔ اور خانے کی تو کبھی زبنت ہی نہیں آئی تھی۔ تاہم مٹی سے لہے ہوئے گدھے روزانہ صبح کے وقت پگڈنڈیوں پر بجاتے ہوئے نظر آتے اور صبح سے لے کر شام تک بستی کی فضا میں چرختے اور چلنے کی آواز گونجتی رہتی

(۲)

یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ مشہور کلمہ جی سردار احمد جہاں اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کھیلتا تھا۔ اُس دوران اور بنجر علاقے میں آٹھ سردار صاحب اپنی معاونت، فیاضی اور انسانیت پرستی کی بنا پر ملک گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ لوگ ان کا نام سنتے ہی فطر ادب و احترام سے سر جھکا لیتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ سردار صاحب تھے بھی، اسی قابل کہ ہر شخص ان کی دل وہاں سے عزت کرے۔ ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ خدا نے کچھ انسانوں کو اس عرض سے دولت مند بنایا ہے۔ کہ وہ دنیا کے مکس اور غریب انسانوں کی کسی طرح مدد کرتے ہیں۔ دولت کا سب سے بڑا معرّف یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کے کام آئے۔

سردار صاحب غریبوں کو آرام پہنچا کر بے حد مسرور ہوتے تھے۔ اور آج خدا داد بستی کی تیز و تند اور شفاف ندی کے کنارے کھڑے ہو کر سردار صاحب اس بنجر علاقے کے بد نصیب مفکوک الحال انسانوں کی حالت زار پر غور کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے۔ یہ لوگ کس قدر بد قسمت ہیں۔ خدا انہیں زندگی کی کوئی کبھی بیش میسر ہے اور نہ ہیون کا کوئی ٹکڑا۔ یہ گدھوں پر بوجھ لادوستے والے لیگ گدھوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ رات دن محنت کرتے ہیں۔ تب کہیں روکھی سوکھی کھا کر پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں۔

اب سردار صاحب کس اور خیال میں غرق ہو گئے۔۔۔ چند لمحوں کے بعد وہ

میں ایک خیال کے آتے ہیں ان کا چہرہ مسرت سے سُرخ ہو گیا۔ انھوں نے سٹریٹ کی راکھ جھاڑی اور ہاس پڑھے ہوئے مٹی کے ڈھیر کو پاؤں مارا۔ مٹی پانی میں گر پڑی ٹکڑ ٹکڑ ہندی کی سلی گھسی ہو گئی۔ ————— !

سردار صاحب نے کچھ دیر پانی کی طرت دیکھا پھر اپنے دوستوں کی طرت چاہے گئے۔

(۳)

سردار صاحب نے جہک کر سوچا تھا۔ وہ کر دکھا یا خدا داؤتی کے ایک گئے شے میں ایک بڑا سانگر خانہ قائم کیا گیا جس کے ساتھ ایک ایک گام تھا اور وہیں گام میں گندم اور ہر قسم کے اناج کی اچھی خاص مقدار موجود تھی۔ بڑے بڑے توند گلوں نے گئے تھے۔ ————— یہ سب کچھ ہوا تھا۔ مگر جن لوگوں کے لئے یہ سب کچھ ہوا تھا۔ وہ اس کارروائی کو بڑی حیرت اور تاسف سے دیکھ رہے تھے۔ حیرت اس لئے کہ ان کو باطل خبر نہیں تھی۔ کہ کیا ہو رہا ہے اور تاسف اس وجہ سے کہ وہ سمجھتے تھے کہ سردار صاحب ان کی بستی پر قبضہ کر لیں گے۔ اور وہ بالکل کے پتلے اور آخری ذریعے سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

سردار صاحب کے ملازموں نے انہیں بھایا کہ کچھ کیا جا رہا ہے انہی کے لئے کیا جا رہا ہے۔ گندم اور اناج کی محدودیاں اس فرض سے رکھی گئی ہیں۔ کہ ان کے لئے ابھی سے اچھی مقدار میں کیا جاسے اور خود اس لئے گواٹے گئے ہیں کہ ان کے لئے دو تین تیار کی جائیں۔ بستی کے لوگ سب کچھ سمجھ چکے تھے۔ پھر بھی کچھ نہیں سمجھ سکتے تھے آخر سردار صاحب کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ ہمارے لئے اتنا دیر معائنہ کر دیں۔ ضرر میں جاتے ہیں تو لوگ اتنی محنت اور مشقت سے نکالی ہوئی مٹی کے لئے ایک وسیلہ دینا بھی گوارا نہیں کرتے۔ پھر ہائیکہ شہر کا ایک دولت مند آدمی ہم سے کوئی کام لئے

بغیر بارے کھانے پینے کا انتظام کر دے۔۔۔۔۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ سردار ضرور کوئی پال پل رہا ہے۔ جسے ہم لوگ نہیں بھگ سکتے۔

دن گزرتے ہمارے تھے۔ اور ہر دن گزرنے کے بعد بستی کے لوگ اپنی زندگی کی پگھلنڈی سے ایک قدم پیچھے ہٹ جاتے تھے۔۔۔۔۔ کچھ دنوں کے بعد جب ان لوگوں کی سبھی میں آیا کہ سردار صاحب نے ان پر رحم کر کے انھیں محنت اور مشقت سے نجات دلا دی ہے۔ تو وہ سوچنے لگے سردار صاحب کو کس نام سے یاد کریں۔ سردار صاحب کے ذکر نے انھیں بتایا کہ سردار صاحب ان کے لئے ان داتا ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ انھیں آئی داتا کہنے لگے۔

اتنا آرام، اتنی آسائش۔۔۔۔۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ اپنا حق من و محی سب کچھ اپنے آئی داتا پر قربانی کر دیں۔ انھیں زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ زندگی میں اتنی بڑی راحت، اتنا بڑا آرام بھی ہے۔ وہ دونوں وقت نگر خانے پر جا کر بیٹ بھر کر کھا لیتے، سردار صاحب کے دے دیے ہوئے کپڑے پہن لیتے۔ اور سارا دن یا تو تماشیاں دیکھتے رہتے یا اس قسم کی دوسری تفریحات میں ڈوبے۔۔۔۔۔ جتے۔

سردار صاحب جب ان لوگوں کو غرضی و خرم دیکھتے تو ان کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ اور انھیں رونی محسوس ہوتا کہ انھوں نے وہ فرض جو انسانیت کی طرف سے ان پر عائد تھا ادا کر دیا ہے۔۔۔۔۔ جب یہ لوگ انھیں آئی داتا کہہ کر ان کے سامنے قربانیاں سربمجرہ پیش کرتے تو ان کا دل ایک خاص عزم سے لبریز ہو جاتا۔۔۔۔۔ اور گھنٹوں ان کے دماغ اور دل پر ایک مستی سی، ایک کیف سا چھا یا رہتا۔

ہذا۔۔۔۔۔ سردار صاحب کی انھوں کی بیٹی بھی باپ کی طرح رحمدل تھی۔ غریبوں

کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اور وہ بھی لوگوں کی عزت سے متاثر ہو کر
 پہروں کڑھتی رہتی تھی۔ باپ کی انسانیت پر ور سرگرمیوں سے اسے خاص دلچسپی تھی ہانہ
 وہ بھی کبھی کبھی خدا داد بستی میں آکر باپ کے ساتھ ان لوگوں سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ یہ لوگ
 اس کی بے حد عزت کرتے تھے۔ اور وہ محسوس کرتی تھی کہ اس کی دوستی ان سے بہت بلند ہے
 اتنی بلند جس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

دن گزرتے جا رہے تھے اور سردار صاحب اور ان کی بیٹی کی نیک نامی ہر جگہ پھیلتی
 جا رہی تھی۔

اب سردار صاحب نے ہمتی میں اپنے بڑے ایک شاندار مکان بنا کر اس میں رہائش اختیار
 کر لی۔ ان کی صاحبزادی بھی چند دن سے وہیں تھی۔ ایک رات سردار صاحب کی اچانک آنکھ
 کھل گئی۔ اور وہ دیکھ کر سخت حیران ہوئے کہ خدا چنگ بد موجود نہیں ہے۔ وہ گھبرا کر
 اُٹھے۔ دو سوے کرے میں گئے۔ خدا وہاں بھی موجود نہیں تھی۔ سردار صاحب کو اپنی بیٹی پر
 بہت غصہ آیا کہ رات کے وقت بھی مہراں کے بیمار بچے کی خبر گیری کے لئے چلی گئی ہے۔
 انھوں نے اُسے کئی بار منع کیا تھا کہ اتنی تکلیف کی تعادل ضرورت نہیں ہے۔ مگر لڑکی کی
 رحم دلی اسے پل بھر بھی پیسے نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔

وہ بچہ اُسے اور مہراں کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی چند ہی قدم اٹھائے چکے
 کہ سامنے جو منظر دیکھا۔ اس سے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مہراں کا شوہر ان کی
 بیٹی کے گلے میں بازو محائل کر کے نہ مظلوم اُسے کیا کہہ رہا تھا۔

حم و غصہ سے سردار صاحب کی آنکھوں کے اندر جیلا چھا گیا۔
 ان کی غضب ناک آواز فضا میں گونجنے لگی۔

مہرین کا شوہران کی بیٹی سے الگ ہو کر نارنجی میں غائب ہو گیا۔
دوسرے دن سردار صاحب کے عازم نگر خانے کی ہر ایک چیز کا ڈالوں میں لاد کر
لے جانا ہے تھے۔

(۴)

کئی سال بعد۔۔۔۔۔

سردار صاحب اپنے چند لوگوں کے ساتھ شام کے وقت موٹر میں بیٹھے ہوئے پہلے
منا سہے تھے۔۔۔۔۔ موٹر اڑی جا رہی تھی۔ یہاں تک کوئی بھاری بھر کم چیز موٹر
سے نکلنی موٹر دھکی اور اس سے پیشتر کہ سردار صاحب ممالک کا یہ ٹرہ لیں۔ وہ کئی
آدمیوں کے زخموں میں گرفتار تھے تمام کارروائی چند منٹ میں ہو گئی۔ سردار صاحب کی
بیمبلی میں جتنی نقدی تھی حملہ کرنے والوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ ڈاکروں نے دیکھتے ہی دیکھتے
لوگوں سے غائب ہو گئے۔

اب سردار صاحب ایک کچر مہری نقدی کے گنا سے کھڑے تھے۔

ناگ! میں پہلے ہی کہتا تھا کہ ادھر سے مت گزریے۔ یہ خدو دوستی کے لوگ
بڑے ڈاکر ہیں۔

یہ خدو دوستی کے لوگ تھے۔

سردار صاحب کے منہ سے نکلا۔ اہو! انھوں نے ننھتے سے ہاس پائے ہوئے منی
کے قوسے کو زور سے پاؤں مارا منی جڑی میں گر پڑی۔ کچر منی چیمینٹیں اڑ کر سردار صاحب
پر جب پڑی۔

کئی منٹ تک سردار صاحب ہوسٹ کھڑے رہے۔

ایک دکان

صبح ہوا شام آدھ پہر ہو یا رات کا پہلا پہر، میں جب بھی بازار سے گزرتے وقت اس دکان کے قریب پہنچتا ہوں تو میری نگاہیں بے اختیار اس کی طرف اٹھ جاتی ہیں، اور میں ایک آدھ لمحہ توقف کئے بغیر آگے قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس کے بارے میں بہت سے واقعات جانتا ہوں۔ یہ واقعات میری آنکھوں کے سامنے رونما ہو چکے ہیں، اور ابھی تک اپنی تمام جزئیات کے ساتھ میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔

اس دکان کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ انسانی تاریخ کی طرح دلچسپ و سہی۔ مگر جتنا انسانوں کو اس سے اتنا گرا تعلق ہے کہ اسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی تاریخ میں سب سے نمایاں چیز کیا ہے۔ مسلسل بدو و بد کامیابی اور ناکامی۔ اور اس دکان کی تاریخ بھی انسانوں کے ایک نہایت مختصر گروہ کی تنگ و دوکش مکش اور کامیابی اور ناکامی کی آئینہ دار ہے۔ اور میں اس سے کافی متاثر ہوں۔ شاید آپ بھی اس میں کچھ دلچسپی محسوس کر سکیں۔ شروع شروع میں جب یہ مکان تعمیر ہوا اور اس کے نچلے حصے کے ایک کمرے کو دکان بنایا گیا تو اس وقت یہاں کوئی تھا اور کیا کرتا تھا۔۔۔ میں وٹوں سے کچھ نہیں کہہ سکتا، کیونکہ اس زمانے میں میں یہاں موجود ہی نہیں تھا، اور مجھے اس دکان کے دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اس میں، دکان کی تاریخ اس وقت شروع ہوتی ہے جب میں اپنے خاندان کے

ساتھ اس کے قریب آکر رہنے لگا۔ اور کچھ بعد دیگرے ان واقعات کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنے لگا۔ جنہیں معرضِ تحریر میں لانے کا کام اس وقت میرے پیشِ نظر ہے۔

جب میں وہاں آیا تو اس دکان میں اللہ بخش پھل لگا کر بیٹھا کرتا تھا۔ اللہ بخش اوجیڑ عمر کا شخص تھا۔ بیٹ شریف اور نیک انسان۔ بچوں کے ساتھ تو اس کا سلوک خاصِ خود پر قابلِ تعریف تھا۔ بازار کے قریب قریب تمام بچے اس دکان سے پھل خرید کر لے جاتے تھے۔ اس کی دھیرہ تھی کہ وہ دوسری دکانوں کی بہ نسبت

انہیں پھل کچھ زیادہ ہی دیتا تھا اور ان کے ساتھ کچھ دیر تک باتیں بھی کر لیتا تھا۔ مثلاً آہستہ آہستہ کہاں ہیں، اب تم کچھ بڑا کر گیا کرو گے۔ سکول میں تمہیں پڑنا تو نہیں پاتا اور امتحان کی تیاری کر رہے ہو؟۔۔۔۔۔ اور اس قسم کی اور باتیں۔۔۔۔۔ کچھ یہ باتیں بڑے شوق سے سنتے اور ہر بات کا لہجہ راہِ رواں جواب دیتے۔ اللہ بخش ان سے صرف خبریت ہی دریافت نہیں کرتا تھا بلکہ نصیحت بھی کرتا رہتا تھا۔ دیکھو بھئی دل لگا کر کام کرو اور بڑے محنت کرتے ہیں وہ بڑے ہو کر کہان ہیں ہلستے ہیں۔ اور جو محنت نہیں کرتے وہ بازاروں میں بھاڑی لگا کر بیٹھ جاتے ہیں، کچھ یہ باتیں ہر روز سنتے رہتے تھے۔ ان کا اور کچھ اثر چوند ہو مگر یہ بات ضرور تھی کہ اللہ بخش بچوں میں بہت مقبول ہو گیا تھا۔

اللہ بخش کے ہاں تین بچے ہوئے تھے۔ دو مر گئے تھے اور ایک بھائی وردان سے کے باہر اسلام آباد لائی سکول میں، بالخصوص کا طالب علم تھا۔ اس کا نام عزیز دین تھا۔ بڑا محنتی اور ذہین لڑکا تھا۔ اور ہمیشہ جماعت میں اول رہتا تھا۔ اللہ بخش کی بڑی آرزو تھی کہ اس کا بچہ بڑا ہو کر کہان بنے، اور عزیز دین بھی، ہاں بے بغیر کہ کہان کیا ہوتا ہے اپنے دل کی گہرائیوں میں کہانی کی آرزو پودرِ شکر کر رہا تھا۔ اللہ بخش کی بیوی بھی اس آرزو میں اپنے شوہر

کے ساتھ برابر کی شریک تھی۔ اس نے اپنے والدین کے گھر بڑی مصیبت کے دن گزارے تھے۔ اس کا باپ غلطی کر تھا جو روزانہ روپیہ ڈیڑھ روپیہ سے زیادہ نہیں کما سکتا تھا۔ سات افراد کے خاندان میں روپیہ ڈیڑھ روپیہ کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ اور جب والدین کے گھر سے مصیبت ہو کر اللہ بخش کے گھر میں آئی تو یہاں بھی غربت کا وہی عام تھا۔ اللہ بخش کی آمدنی معقول تھی۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اُس کے کندھوں پر باپ کے چھوڑے ہوئے قرض کا بوجھ گراں بھی آ پڑا تھا، اور اس آمدنی کا اکثر و بیشتر حصہ قرض خواہوں کی جیبوں میں جلا جاتا تھا۔ عزیز دین کی ماں بیٹے صبر اور ————— کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس کی تاریک دنیا میں اُس کا اکلوتا بیٹا اسید کی گونہ بن کر چم رہا تھا۔ وہ اکثر خواب دیکھا کرتی تھی کہ عزیز دین پر سائی سے فارغ ہو کر کپتان بن گیا ہے۔ اس کی دودھی بڑی خواہش ہے ————— دودھی کے ٹخن چمک رہے ہیں ————— اس کے پیٹھ پر ایک بڑا خرچہ صورت تھوڑا بڑا ہے ————— اور ایک بڑے عالی شان مکان کے دروازے پر اس کی موٹر گھڑی ہے اور وہ موٹر سے اُنکر اس کی طرف آرہا ہے۔

اللہ بخش کی بیوی کا بچا دہلی میں رہتا تھا، جو بیٹھنے میں دو ایک بار خط و رو بھیجا کرتا تھا۔ یہ خط پڑھوانے کے لئے اللہ بخش کی بیوی بھی کوٹھیا کرتی تھی۔ اور باتوں باتوں میں غمزدہ پڑھتی تھی کہ کپتان کی خواہش کتنی ہوتی ہے اور وہ کتنا بڑا آدمی ہوتا ہے ————— میں اُس کی باتوں کا جواب دیتا تو وہ خط ہاتھ میں قلم سے دینک اپنے سہریا سپنوں کی فضا میں کھول دیتی! میں پوچھتا تھا: تم عزیز کو کپتان بنا کر دے چھوڑ دے گی!۔

اس پر وہ ہنس پڑتی ————— باؤ آتا تھا آج تو بڑا ٹیک اور ہشیار ہے

جو کپتان بنے گا!

اللہ بخش کی بیوی اپنے شوہر کو باؤ کہتی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ شادی سے پہلے باؤ کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ مگر باؤ کے بھلے اس کو ایک بھل بیچنے والا بنا۔ اور اب وہ اسی کو باؤ کچھ کر نفسیاتی طور پر اپنے باؤس دل کے لئے ایک غیر مہم لمیڈ کا سہارا پیدا کر رہی تھی۔

اللہ بخش کو اس دکان سے خاص محبت تھی۔ گرمی ہو یا سردی۔ ہر روز صبح سویرے بھلوں کے ٹوکروں کو ایک لمبی سی چاند سے ڈھانک کر بھارتو سے دکان کے ہر ایک کونے کھد سے کو پوری طرح صاف کرنا اس کا معمول تھا۔ اور اس میں کبھی تاخیر نہیں ہوتا تھا۔

اللہ بخش نے کئی مرتبہ اپنی جیب سے خرچ کر کے اس کی مرمت بھی کرائی تھی۔ کیونکہ دکان کے مالک کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے دلچسپی صرف کرائے سے تھی۔ مادہ بہ جزر استہائی با قاعدگی کے ساتھ ہر ماہ اس کے پاس پہنچ جاتی تھی۔

مجھے یاد نہیں پانا کہ اس نے کبھی کسی پتے سے تنہا بیس بات کی ہو۔ مگر اس پتے کو وہ ضرور چھوڑ کر دیتا جو کوٹھے سے اگلے دوکان کے دروازے پر لٹکا کر دیتا۔ اللہ بخش کو اس دکان سے اتنی شدید محبت اس لئے تھی کہ یہ دکان اس کے خاندان کو روٹی سے رہی تھی۔ اس کی بنیادی ضرورتیں پوری کر رہی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے بچوں کو تعلیم دینا ایک ایسی منزل کی طرف لئے ہماری تھی جہاں پہنچ کر اسے کہنا پڑتا تھا!

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں کوئی چیز بیچنے کے لئے دکان پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اللہ بخش خلاف معمول بالیوسی کی حالت میں سر جھکاٹے بیٹھا ہے۔ میں نے کبھی اللہ بخش کو ایسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے پوچھا

”کیا ہوا اللہ بخش؟“

”کچھ نہیں ہوا“

تھر بھی — تم اُناس نظر آرہے ہو۔

اللہ بخش نے آہ بھری اور جھپٹی سے کھجوروں پر بھینسا قی ہوئی کھیاں ہٹا کر دلا حاجی صاحب (دکان کے مالک) دُکّا کرایہ مانگتے ہیں میں تو یہ کرایہ بھی اللہ جانتا ہے بڑی مشکل سے ادا کرتا ہوں۔

کوئی فکر نہ کر اللہ بخش میں حاجی صاحب کے سمجھاؤ لگا۔ چند روپے معمولی کرایہ نہیں ہے! تم کیا سمجھاؤ گے بالہ — تیس روپے دینے والا کبھی موجود ہے؟ اللہ بخش نے لمبی آہ بھر کر کہا۔

پھر بھی میں کوشش کروں گا۔ تم گیارہ بارہ سال سے یہاں ہو، بھر تم نے کبھی کرایہ ادا کرنے میں بھی دیر نہیں لگائی — ایسے شریف آدمی کا حاجی صاحب کو کچھ تو لحاظ کرنا چاہیے؟

اچھا — بی

دو چار لوگ اور بھی وہاں آگئے — اور انھوں نے بیک زبان اللہ بخش کو قلعیدہ دلا دیا مگر حاجی نے قہقہے نکال دیاتو تمہاری جگہ جو شخص بھی آئے سمجھا، بازار کے سب لوگ اُس کا ہائیکاٹ کر دیں گے۔ یہ الفاظ اُس نے اللہ بخش کی کچھ بھی آنکھوں میں اُمید کی روشنی جھلکانے لگے۔ وہ بہت حد تک مطمئن ہو گیا اور اسی دن بازار والوں کے اس خطرناک ارادے کی خبر حاجی صاحب تک پہنچ گئی۔

پندرہ برس دن گزر گئے مگر اس دکان میں اللہ بخش ہی بیٹھا تھا جیسے پہلیں ہو گیا کہ ہماری تنبیہ کامیاب ثابت ہوئی ہے اور حاجی صاحب اپنے ارادے سے باز آگئے ہیں اور اب وہ اللہ بخش کو دکان سے الگ نہیں کریں گے۔ مگر ایک دن میں نے دیکھا کہ دکان بند

یکھت الٹہ بخش کے چہرے کا رنگ رگڑ میں آئے ہوئے کوٹنے کی طرح سیاہ ہو گیا۔
 باؤنگی بے جا وہ جڑھ نہیں سکے۔ بھیس (فیس) کے لئے پیسے کہاں سے لانا۔
 ۔۔۔۔ آپ صاحبی صاحب کے کہہ دکان لے دیجئے۔ لے ویں گے نا ہاؤنگی!
 چند دن کے بعد میں الٹہ بخش کو کہیں بھی نہ دیکھ سکے۔ وہ اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر
 نہ جانے کہاں چلا گیا تھا!

الٹہ بخش کے بعد اس دکان میں رمضان دودھی آجٹا۔ رمضان دودھی اس بازار میں
 نہیں رہتا تھا، بلکہ موچی دودھانے کے اندر کھجور چلی ہیں رہتا تھا اور اس کی چھوٹی سی دکان تنگ
 دودھانے کے باہر مناسب بان فروش کی دکان کے ساتھ ملحق تھی اور دونوں میں دکان کی حد بندی
 کے معاملے پر اکثر توڑیں ہی ہوتی رہتی تھی۔ اس لئے رمضان دودھ کسی ابھی دکان کی تلاش
 میں مگر وہاں تھا۔ ایک دن اس کی حادثات مادی صاحب سے ہو گئی اور اس نے دکان کھلے
 تھیں دوپہر پانچ بجے اور اگر سنہ ہوا اپنی رہنا مندی نہ ہو کر دی۔ اور اس کا نتیجہ ہو کر الٹہ بخش
 کو مجبوراً دکان سے نکال دیا اور اس کی بجائے یہاں رمضان آگیا۔۔۔۔۔ یہاں سارے
 بازار میں اس کے علاوہ صرف ایک اور دودھی کی دکان بھی تھی اور چونکہ رمضان کام محنت اور
 صفائی سے کرتا تھا اس لئے دودھانے کے مقابلے میں اُسے زیادہ کام سننے لگا اور اسی
 نسبت سے اس کی آمدنی میں بھی اضافہ ہو گیا۔

رمضان اپنی بڑھتی ہوئی آمدنی کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی
 تیزی سے اپنی بڑھی لڑکی کے لئے جینز کا سامان تیار کر لیا تھا۔ علاوہ ازیں بس قرض کا جینز
 بھی ادا کر دیا۔ اسے باپ کی موت پر بطور دوشے کے ملتا تھا اس نے خود خرچ کر کے دکان کی
 صفائی کرائی اور دودھانے پر رنگ۔ کرایا اور آرائش کے لئے دکان کی پیشانی پر پتیل کے دو بلب

بھی نکلا دینا خوشام کے وقت دودھ دوزنک، دیشنی چمکا دیتے تھے۔ بھگتین بھگتین کا
رمضان کے اس دکان میں قدم جم چکے ہیں۔ اور وہ کبھی دس سے عیدہ نہیں ہرگا۔ اور سماجی
صاحب کو بھی ضرورت دینی آئے گی کہ وہ اسے دکان سے عیدہ ہونے کے لئے کہیں۔

ایک دن — اور وہ جو وہاں تھا — میں رمضان کو تبصص کے لئے گھر سے
رہا تھا کہ حاجی صاحب کھنڈا ہنڈ کچھ پڑھتے ہوئے اور آئے حاجی صاحب کو دیکھتے
ہی رمضان نے بلند آواز میں سلاماں علیکم کہا اور فوراً کپڑے سے کڑی صاف کر کے
دکان کے باہر نوسے پر لگا دی۔

حاجی صاحب بیٹھ گئے اور اپنی خزانہ دانی دانی میں آنکھیاں پھیرتے ہوئے بولے
رمضان! محمد کی نافرمانی پر مسمی تم نے؟

رمضان نے آنکھیں اٹھا کر شرمندگی میں بے اختیار جھجک گئیں۔ "نہیں حاجی جی۔"

— میرے کپڑے عذاب تھے۔ ات جیسے گروہ میں چیشاب کر دیا تھا۔

نہت بڑی بات "حاجی صاحب نے نفرت اور انوس کے لئے جیل لیج میں کیا زور
کر صاف کر سکتے تھے کپڑے۔۔۔ دیکھو بھائی نانا پڑھا کرو۔ اللہ فرق میں برکت یا
جہ۔۔۔ کہہ کر حاجی صاحب نے یکساں آواز بھری۔ "اور خدائے شکر ہے میں ہم
اپنے بھائی دیکھنے والے کہ بھولتی بات تھی؟"

نہیں! یہ خاتہ پڑھا کروں گا حاجی جی!۔ رمضان نے وعدہ کر لیا۔

قریب پڑھا کر۔۔۔ اللہ اپنے بندے کو کبھی نہیں بھولتا میرے خدا کی
بتاب میں کوئی کجی نہیں۔۔۔ دیکھنے والے کے رنگ نیارے ہیں؟

اور اسمان بھڑکی دیکھنے والے کے نیارے رنگ پر غصہ کرنے لگا۔ اس کی آمدنی

میں مصقول اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی بڑھی روکی کے بیاہنے کے لئے مجھیز کا سامان ہوتا تھا۔ تمام کا تمام قرض اُڑ چکا تھا۔ دینے والے کے رنگ نایاب نہیں قرار کیا تھا۔ یہ رمضان اور غزوہ کرتا پر جا ہی صاحبِ دوسرے چھینکے اندر کنڈھے پر پڑے ہوئے درو رنگ کے رومال سے منہ پر نہچتے ہوئے ہوئے۔

ایک عجیب معاملہ درپیش ہے رمضان!

نہی جاسی، جی، ہاں، رمضان کا چہرہ ایک لختِ سنجیدہ ہو گیا۔ اس کے اچھے میں گڑبگڑ کی
کا احساس نمایاں تھا۔

تم جانتے ہو ہماری عادت کہ کسی سے وعدہ کر لیں تو اسے پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے
ہیں۔ اس میں ہمیں زیادہ نقصان ہی اٹھانا پڑے۔ تو معاملہ یہ ہے بھائی کہ بازار والے
تمہارے یہاں آسنے کی مخالفت کرتے تھے کہ ایک غیر محفلے کا آدمی ہمارے محفلے میں کیوں
آئے؟ لیکن میں نے پورا کر دیا۔ تم سے وعدہ کر چکا تھا۔

یہ نیکو دلوں کے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ میں "گناہگار" سے ہم ہوں۔ رمضانِ شریف کو ہلا۔

تجارتی مٹھوٹے دہشتے کی بات، چھوٹو — یہ ذبیحہ کہتے تو ٹیک ہیں نہ ماہی
صاحب نے دوبارہ وہاں سے اپنا منہ پھینکا۔

خارجی جو کون کتنا ہے؟ رمضان کی سنگینیں سُرخ ہو گئیں۔

لوگوں کہتے ہیں: اے بھائی! کوئی نہیں کہتا۔ مگر تم کو کہتے ہیں۔ وہی کریم۔

گنجشایلی — رمضانہ جلدی سے بولا۔ اور اس کے چہرے سے تمام غمیں گئی۔
وعدہ ہو گئی۔

استغفر اللہ..... میاں ایشہ مرزا اور تمہیں فکڑا کر دے تو؟

نک کہ ہا پانچا۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ اور اس کے دوسرے دن حاجی صاحب نے رمضان کو اپنا فیصلہ سنادیا کہ چونکہ معاملہ بڑھ گیا ہے۔ اس لئے تمہارا دکان میں رہنا ٹھیک نہیں۔
 اور رمضان کو مجھ پر دکان چھوڑنا پڑی۔

رمضان روزی کے جانے کے بعد دکان ایک ہفتہ تک بند رہی۔ ایک مہینے کے بعد کئی قریب نے دیکھا کہ اس کے اندر کپڑے کا کاروبار کرنے والے لالہ دین دیال بیٹھے ہیں اور اُسی کے ارد گرد کپڑے کے بیسیوں تھان پڑے ہیں۔ رمضان کے بعد اصولاً یہاں کریم کو آنا چاہیے تھا۔ مگر آگے لالہ جی۔ یہ معنا کیا ہے؟ میں نے سوچا اور دوسرے دن ہی اصل حقیقت ظاہر ہو گئی۔ حاجی صاحب نے کریم سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر تو مجھے چند ماہ کا پیشگی کرایہ ادا کر دے تو میں تجھے دکان خالی کرادوں گا۔ کریم نے پیشگی کرایہ ادا کر دینے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ اور جب رمضان مجھ پر دکان خالی کرنے لگا تو لالہ جی نے جانے کس طرح میدان میں آگودے۔ اور انھوں نے حاجی صاحب پر نہ جانے کیا اثر ڈالاکہ دکان ان کو مل گئی۔ شاید انھوں نے سال بھر کا پیشگی کرایہ دے دیا ہو گا۔ یا کرائے میں معقول اضافہ کر دیا ہو گا۔ کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہوگی۔ جس نے حاجی صاحب کو متاثر کر دیا تھا۔

جب میں نے لالہ جی کو دکان پر دیکھا تو دل میں کچھ دیا کہ اب یہ دکان آخری دن تک لالہ جی کے پاس رہے گی، اور جب لالہ جی دنیا سے رخصت ہو جائیں گے تو ان کا بیٹا یا بہن آئیے گا۔ اور بیٹے کے بعد اس کا بیٹا، اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔

دو سال تک تو میرا یہ یقین غیر متزلزل رہا۔ اور حاجی صاحب کو ان کے خلاف کسی قسم کی شکایت پیدا نہ ہوئی، اور شکایت پیدا ہو بھی کیونکر سکتی تھی۔ انھیں گھر بیٹھے معقول کرایہ مل رہا تھا۔ اس کے علاوہ کپڑے کے معاملے میں بھی انھیں کافی مراعات حاصل تھیں جس قسم کہ

کڑا چاہتے تھے۔ لارڈ جی سے بارعایت خرید کرنے جاتے تھے۔ اور کیا چاہیے تھا انہیں؟ ہمارے بازار میں بہتہ والوں کی اکثریت مسلمان تھی۔ ہندو اور سکھوں کے چند گھر تھے۔ یہ لوگ اچھے ہسالیوں کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ کامیاب کرتے تھے۔ دھڑوں میں جاتے تھے اور اپنے ہسالیوں کے ساتھ عام اجتماعی تقریبات میں بھی برابر حصہ لیتے تھے۔ شہر کے دوسرے حصوں کے بارے میں مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ ہمارے بازار میں کبھی ہندو مسلم مسائل پیدا نہیں ہوا تھا۔ اسی ماحول میں میں نے ایک دن ٹناک بھاری مسجد کے امام صاحب کو حاجی صاحب سے اس بارے میں سخت شکایت ہے کہ انھوں نے اپنے کسی مسلمان بھائی کی بجائے دکان ایک ہندو کو دے دی ہے۔

یہ اعتراض ہمارے بازار میں اپنی نوعیت کا پہلا اعتراض تھا اور اجتماعی زندگی کے متعلق ایک نئے زاویہ نگاہ کو منظر عام پر لا رہا تھا۔ پچھلے پھل تو لوگوں نے اس کا طاق توجہ نہ دی۔ اور وی جی تو اسے کوئی خاص اہم معاملہ نہ سمجھا۔ مگر ایک دن جب ہم ٹنا نے نماز کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ تک قرآنی وحدت کی روشنی میں خیر مسلمانوں کی ذہنی خباثت پر تقریر کی تو لوگوں میں چہرے گہریں جھٹنے لگیں۔ یوں مخصوص ہوتا تھا جیسے بازار کی سافٹ اشاعت اور بڑے سکون زندگی کی تھری ہرٹی بھیل میں بھگت ایک بڑا بھاری پتھر آگرا ہے۔ اور پاروں طرت ایک بھلے سی گئی ہے۔ بازار کے سچے والے دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک پارٹی لالہ جی کی حمایت پر تھی اور انہیں دکان سے الگ کرنا پھر منصفانہ فعلی سمجھتی تھی اور دوسری پارٹی وہ تھی جو امام صاحب سے شدید عقیدت رکھتی تھی۔ اور ان کی ہر بات کو صحیح سمجھنے کا متعلق تھا۔ تقاضا سمجھتی تھی۔ یہی پارٹی لالہ جی کے خلاف تھی۔ ایک دوسری طرف

پادشہوں کے چند اومبروں کے درمیان ہلکی سی چپقلش بھی ہوئی اور معاملہ بڑھ جاتا کہ بالآخر مصلحتاً خود ہی مکان سے الگ ہو گئے۔

مذہبی کے الگ ہو جانے کے بعد غیر مسلم پٹے کی طرح مسلمانوں کے بڑے اچھے ہمارے تھے اور ان کی تقریبات میں ایک حد تک حصہ بھی لیتے تھے، اور مسلمانوں نے بھی ان کے ساتھ دیرینہ تعلقات متقطع نہیں کئے تھے۔ مگر ایک کفیلگی سے پیدا ہو گئی تھی، دونوں کے درمیان اور ایک دوسرے سے راستہ کرنے لگا تھا، ان کی معاشرتی زندگی میں۔

دارجی بدایا بستر اسمیٹ کر پٹے گئے مگر جو دھری طفیل کا بھانجرا محمد نذیر اس دکان کو سمجھانے لگا۔ جو دھری طفیل بازار کیا شہر کے خیر لوگوں میں سے تھے، اہم جماعت کو فقیروں کو روٹی بھلاتے تھے۔ اور مسجد اور امام مسجد کے معاملے میں تو خاص دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی حبیب سے مدد پر خرچ کر کے امام صاحب کے لئے مسجد کے اندر ایک خوبصورت حجرہ بنوایا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے گھر سے لفظاً امام صاحب کے لئے روٹی بھی جاتی تھی۔ نذیر احمد انھی جو دھری صاحب کے بھانجے تھے۔ اپنے والدین کے ساتھ جنوبی افریقہ سے آئے تھے۔ پر شے لکھ آوی نہیں تھے۔ اس لئے تجارت کرنا چاہتے تھے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ بازار میں کوئی دکان کھول کر کام شروع کریں۔ مگر محلے میں کوئی دکان خالی نہیں تھی۔ اور آخر انھیں دکان مل ہی گئی۔

تو یہ ہے اس دکان کی تاریخ۔ چودہ سال کی مدت میں جتنے واقعات اس کے ساتھ پیش آئے وہ میں نے لکھ دیئے ہیں۔ نذیر احمد کو یہاں بیٹھے ہوئے پانچواں سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دوران میں کوئی واقعہ نہیں ہوا۔

اور آج فردی کی پہلی تاریخ ہے۔ حاجی صاحب جنوری کا کرایہ وصول کرنے کے

لئے دکان پر تشریف لائے ہیں۔۔۔۔۔ نذیر احمد صاحب نے حبیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کا بھڈل نکالا ہے۔

”اُن لوگوں کو تنگ کرتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی۔ حاجی صاحب وارڈھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”آپ کو تنگ کرتے ہیں، کس مُردار میں انہی جرأت ہے کہ آپ کو تنگ کرے جیسے تائیے جناب حاجی جی، ہم مر گئے ہیں کیا؟“ غلیظ احمد کی رگ بعقیدت ہندی پھرک اٹھتی ہے۔

۔۔۔۔۔ وہ آج شیخ نیاز علی کو رہا تھا۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ دکان کے لئے دس

روپے زیادہ دینے کے لئے تیار ہوں۔۔۔۔۔

”کیا۔۔۔۔۔ حاجی جی!؟“

آزادی

ہر روز صبح کے وقت جیسے ہی نازک دکھیں کھٹنے گتیں، اور لوگوں کے آنے جانے سے پہلے پہل شروع ہوتی، نفا میں بار بار ایک کنویر، افسردہ اور مضطرب آواز گونج اٹھتی تباہ اللہ کے نام پہ اندھی کو دے جا۔ اللہ کے نام پہ اندھی کو دے جا۔ یہ آواز غاڑاں کی تھی۔ اندھی غاڑاں کی جو صبح سے شام تک مسلسل پیچ پیچ کر اپنے اندھے ہونے کا اعلان کرتی رہتی مگر ستم نہ رہتی یہ تھی کہ بازار میں سے گزرتے والی ہزاروں آنکھوں میں سے صرف چند آنکھیں ہی ایسی ہوتی تھیں جو اسے دکھ سکتی تھیں، کیونکہ جب وہ ٹھٹھک کر اپنے پیچھے ہٹے ہاتھ کھینچ کر گھر کے اندر جاتی تھی تو اس کی جھولی میں کبھی تو سات آنے کے پیسے ہوتے تھے کبھی آٹھ آنے کے اور کبھی ان پیسوں سے بھی کم۔ ہاں تو وار کے موقع پر ریوڑ سواروں پر ہوجاتا تھا۔ مگر ظاہر ہے ہر سہ سال میں تو وار چار پانچ سے زیادہ نہیں ہوتے اور تین سو چھپا سٹھ دنوں میں سے صرف پانچ چھ مرتبہ اوسط آمدنی سے کچھ زیادہ کمالینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ جس دن غاڑاں کی آمدنی مجددہ آٹھوں سے زیادہ ہوتی اس دن وہ خوش خوشی چھوڑے سے اٹھ کر اندر جاتی کیونکہ کئی ہفتوں کے بعد ہی ایک ایسا دن ہوتا جب اُسے اور گھر والوں کو گشت سبزی ملتی، اور روٹی کے بعد کوئی ٹیسی تیز بھی، ورنہ ہر روز روٹی کے ساتھ وال، خالی سبزی یا مولی ملتی، اور یہ چیزیں کھا کھا کر وہ بیزاری ہو جاتی۔

فاخران اپنے پیٹ کے ہاتھوں بھیک مانگنے پر مجبور تھے۔ صرف اپنے پیٹ کے لئے ہی نہیں، اوداؤد پیٹ بھی اس کے پیچھے ہوئے ہاتھوں سے وابستہ تھے۔ ایک پیٹ تو اس کی بڑی ہنس نینو کا تھا۔ نرنو کی عمر اٹھارہ سال کے گگ بگ ہر ہی تھی۔ اوداؤد کوئی پکھلے، سالن تیار کرنے اور کبھی کبھی پیٹے کھیلے کپڑے دھوٹنے کے سوا اود کوئی کام نہیں تھا۔ چنانچہ وہ دن کا بیشتر حصہ چار پائی پر لیٹے لیٹے گزار دیتی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ کیونکہ کئی بار ماں نے اسے ڈانٹ پلائی تھی کہ اگر تو باہر نکل تو میری ٹانگیں توڑی جائیں گی۔ وہ ماں کے ڈر سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ گھر میں کوئی مصروفیت بھی نہیں تھی۔ پرانی چار پائی پر بے کار پڑی رہتی تھی۔ دوسرا پیٹ فاخران کی ماں کا تھا۔ فاخران کی ماں نامہ ارض تھی۔ دسے کی بڑا قی اود ملک بیماری اس کے جسم کا خون چوستی رہتی تھی، اود خیریت نہ ہوا۔ ہڈیوں کا بغیر بنی ہر وقت اپنی چار پائی کے نیچے بلغم کے انبار لگاتی رہتی۔ نرنو کو دن میں کئی کئی بار جھانک دینا پڑتی اود ہر بار جب ہڈی اس کے سینے میں بادل گر جتنے لگتے وہ چپ چاپ چار پائی سے اٹھ کر چھاڑو کا رخ کرتی اود جگہ صاف کرنے کے بعد چار پائی پر گر پڑتی۔

فاخران کی عمر ساڑھے آٹھ سال سے زیاں نہیں تھی۔ اور چونکہ قد لمبا تھا اس لئے کچھ زیادہ مٹھری کی سلوم ہوتی تھی۔ اس کے داوالے کبھی بھیک نہیں مانگی تھی۔ اس کے باپ نے کبھی گداگری نہیں کی تھی۔ اس کی ماں نے کبھی دوسروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے تھے۔ مگر وہ بھیک مانگنے پر مجبور تھی۔ کیونکہ صبح شام اس کا اود اس کی ماں ہنس کا پیٹ کھانے کو لگتا تھا، اور کھانا صرف پیچھے ہوئے ہاتھ ہی لاسکتے تھے۔ نرنو صرف مانگ کھیل سکتا تھا۔ اود وہ ہر روز بھیک مانگتی تھی۔ فاخران کے ذہن میں اپنے اودان دودیشن کا خیال ہر لمحہ ایک نوکرار کھانے کی طرح جھجکا رہتا تھا، اور کبھی کبھی تو یہ خیال رات کو سنے میں بھی لے

مضطرب کر دیتا تھا۔ اور وہ بے اختیار اس کے پہلو سے اٹھ کر، ہاتھ پھیلا کر وہی افسانہ کہتی جنہیں ہر روز ہزاروں مرتبہ اپنی زبان سے نکالتی تھی اور جنہیں بار بار دہرا کر اس کا گلا بیٹھ جاتا تھا۔

ناخراں اور اس کے گھر والے تقسیم سے پیشتر فیروز پور چھاؤنی میں رہتے تھے، جہاں اس کا باپ جلد سازی کا کام کرتا تھا اور روزانہ ڈیڑھ دو روپے کمالیا تھا۔ وہ اگرچہ انہی تھا اور روزمرہ پانچ چھ آنے کی انیم اور تین چار آنے کا حلوہ منرو کھالیا تھا تاہم گھر میں کبھی فاقے کی قربت نہیں آئی تھی۔ عبداللہ کے ہاتھ میں بڑی صفائی تھی، سکولوں کے طالب علم تھی، سماعت کی کتابیں جلد بندی کے لئے اسی کو دیتے تھے۔ اور سیزن میں تو وہ روزانہ چھ سات سات روپے بھی کمالیا تھا، یہ خوش مالی کی زندگی نہیں تھی تاہم بڑی زندگی ملی نہیں تھی۔ اچھا خاصہ گزرا ہوا تھا، مگر فقر و رازہ فساد کے دوران میں ان لوگوں کو لاہور آنا پڑا۔ موہا پارہا کی پمپ میں رہنے کے بعد انہیں گنتی بازار کے ایک کونے میں رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا مکان مل گیا اور یہاں ان کی زندگی کا ایک نیا بعد شروع ہو گیا۔

عبداللہ نے کسی نہ کسی طرح جلد سازی کا کچھ سامان اکٹھا کر کے اپنے مکان کے چبوترے پر کام شروع کر دیا، لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کے بازو کے دسبے والوں کی زیادہ تعداد موہا پور کی تھی۔ ان لوگوں کے سامنے تو صرف زندہ رہنے ہی کا سوال تھا، یہ تھا ایسی حالت میں کتابوں کی طرف کوئی توجہ کرتا اور کوئی جلدیں بندھوانا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عبداللہ چھ دن میں چھ آنے بھی نہ کمال سکا۔ اسے پیٹ بھرنے کو کسی نہ کسی طرح روٹی مل گئی، لیکن افیون نہ مل سکی۔ اس کی صحت پچھلے ہی کافی کمزور تھی اور کمزور ہو گئی، اور سات دن بیمار رہنے کے بعد وہ ہل بڑا اس کی موت کے بعد چند خوارق ہمایوں نے اس بے کس و ناوار خاندان کی ہمدردی کا

برجھاپتے کندھوں پر اٹھالیا۔ چند دن تو گزارا ہوتا رہا مگر اس کے بعد ان کی توجہ میں کمی آئے گی۔ اس زمانے میں ہر ایک کو اپنی فکر پڑی تھی، چنانچہ گھر میں تنگ دستی فالتے کی حد تک پہنچنے لگی۔ اس وقت زندہ رہنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اتفاق کی بات ایک دن فاطمہ اس چھوٹے بچہ کو اس کے باپ نے کام شروع کیا تھا، بیٹی گڑکھا رہی تھی، کہ ایک شخص نے اس کے پھٹے پڑے کپڑوں سے یہ اندازہ کر کے کہ وہ بھکاری ہے اس کے ہاتھ میں دو آنے رکھ دیئے۔ یہ اس کی اور اس کی ماں بہن کے لئے زندگی کا نیا آسرا تھا، چنانچہ دوسرے دن وہ وہیں ہاتھ پھیلائے خاموش بیٹھی رہی۔ کچھ دیر کے بعد اس کے ہاتھ میں پونے تین آنے جمع ہو گئے، اتنے وہ باتا بھیکسا گھٹنے لگی، اور اپنے اندر سے ہی کا اعلان بھی کرنے لگی۔ جب تک وہ چھوٹے پر پہنچی اس کے دماغ میں یہ خیال چھایا رہا کہ کب سات اٹھ انڈوں کے پیسے جمع ہوں گے اور کب وہ اند جائے گی۔ جب تک پیسے اتنی تعداد میں جمع نہ ہوتے وہ اس خیال سے پریشانی رہتی کہ اگر لوگوں نے کچھ نہ دیا تو اس کی ماں بھی گرفتار کرنا پڑے گا، دونوں بھوکے رہیں گی۔ وہ خود خائفہ کر سکتی تھی مگر یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی مریض ماں اور بہن بھوکے سو جائیں!

اور یہ سلسلہ سات ماہ سے جاری تھا۔ اور اب تو وہ اس معاملے میں اس قدر تجربہ کار ہو چکی تھی کہ جب بھی اس کے تیز اور تجربہ کار کالوں کو قریب آتے ہوئے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی۔ فوراً اس کا ہاتھ پیسے کے لئے آگے بڑھاتا، اور اسے یقینی ہو جاتا کہ پاؤں کی آہٹ اس کے لئے خوش خبری کا پیغام لے کر آئی ہے۔ جیسے ہی سخت مسئلہ اس کی ہتھیلی میں گرتا اسے اندازہ ہو جاتا کہ دینے والے نے اُسے کیا دیا ہے، اور اسی نسبت سے اس کے ذہن میں خوشی کی کیفیت بھی لگاتے گئی! مگر یہ کیفیت عارضی ثابت ہوتی۔

اتوار کی دوپہر تھی۔ فاختراں حسب معمول ہاتھ پھیلائے اپنی بے چارگی سے آگے جانے والوں کے جذبہٴ رحم کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اتنے میں پاؤں کی آہٹ اس کے قریب آنے لگی۔ اس کے چہرے پر اُمید کی تضحیٰ سی کرن لڑائی۔ اس کا ایک ہاتھ آگے بڑھ گیا، لہو وہ اس بات کا انتظار کرنے لگی کہ کب سکتا اس کی ہتھیلی میں آئے اور اٹھتیرا بھلا کرے گا فقرہ نکلے۔ اس کا ہاتھ پھیلا رہا، کوئی سخت چیز اس کی ہتھیلی میں ڈگر لگے۔ یہ کیا بات ہے۔ اس قسم کا حادثہ پہلے تو کبھی نہیں چڑا ہے۔ رحم دل شخص خیرات دے کر آگے بڑھ جاتا ہے، لیکن یہ کرن ہے جو اس کے پاس کھڑا ہے، وہ کچھ رہی تھی کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے، اتنے میں آواز آئی۔

”کیوں نہ کی! تو مانگ کیوں رہی ہے؟“

عجیب سوال تھا! آؤ کوئی نہیں جانتا کہ مانگنے والا کیوں مانگتا ہے! اسے اب تک اس قسم کا سوال کسی نے نہیں کیا تھا۔ پہلی مرتبہ سوال کے الفاظ سن کر وہ خاموش رہی۔

”بے چاری اندھی ہے۔ دوسری آواز نے کہا۔“

اب اسے معلوم ہو گیا کہ اس کے پاس ایک نہیں دو آدمی کھڑے ہیں۔

تو کی تو باقی نہیں، بس ایک کیوں مانگ رہی ہے۔ گھر میں کمانے والا نہیں ہے؟

نہی نہیں۔ اب مر گیا ہے النان۔ مانگ ہے، کہاں سے کھائیں؟ اس نے جوابا کہا۔

ادھر۔۔۔ تو گھر میں کوئی نہیں۔۔۔ غریبوں کی حالت وہی ہے جو پہلے تھی بلکہ

زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ ایک آواز نے کہا۔ اس پر دوسری بولی۔

اس ملک کے امیروں کو آواز دی جلی ہے غریبوں کو نہیں۔ دوسری آواز نے اس کی

ہتھیلی پر چار آنے رکھ دیئے۔

سروٹ بدل کر جھوٹ موٹ خراشے لیئے گی۔ کچھ دیر کے بعد زینو شاید سو گئی، مگر فاخران کی آنکھوں میں نیند نہیں آتی تھی، وہ ابھی تک سوچ رہی تھی کہ غریبوں کو آزادی کیسے نہیں ملی۔ کب ملے گی غریبوں کو آزادی — سوچتے سوچتے آخر کار وہ شک کر سو گئی۔

صبح جب فاخران جاگی تو زینو معمول کے مطابق انگلیٹھی میں آگ ٹٹکا رہی تھی، ابھی چلے تیار ہونے میں کچھ دیر باقی تھی، وہ اکٹھ بیٹھی اور اپنے اُبلجے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پھر وہی بات سوچنے لگی، غریبوں کو کب آزادی ملے گی۔ وہ یہ بات سوچ ہی رہی تھی کہ زینو انگلیٹھی پر کچھ رکھتے ہوئے بولی

”نمبر سوچ رہی ہے آزادی کیا ہے؟“

”کیا ہے؟“ ماں بولی۔

”یہ فاخران؟“

”کیا ہے فاخران کو؟ بیمار ہو گئی ہے؟“ ماں کو ایک نئی سکر نے آد بوجھا۔ چند ماہ پہلے جب فاخران بیمار ہو گئی تھی تو ان دونوں کو دونوں تک فائر کرنا پڑا تھا کیونکہ گھر میں جتنے پیسے تھے وہ سب فاخران کے دوا داروں میں خرچ ہو گئے تھے۔ ایک ہی چیز ہو سکتی تھی یا دوا آتی یا گھر میں روٹی بکنی۔ دوا آئی اور پوٹھا ٹھنڈا رہا۔

”نہیں بے پیسے یہ پوچھتی ہے غریبوں کو آزادی کب ملے گی؟“

”اُن نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ہم عاجزوں کو آزادی سے کیا واسطہ؟ زیادہ سیت گئی ہے، تھوڑی رو گئی ہے سیریت ہوئے گی۔ اور وہ کھائے گی۔ ہائے — سر گئی۔“

”جائے گی ہے تو تو ت پر روٹی رکھ دے زینو؟“

اُجھا ہے بے با!

اور جس وقت فاخران مٹی کے کونڈے میں گرم گرم چائے کے اندراجات کی بھیجی ہوئی میٹھی روٹی کے ٹکڑے ڈالنے لگی تو وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ آنا دی سے ملو ابھی ابھی چیزوں سے ہیٹ بھرنا ہے، معمولی چیزوں سے نہیں۔ اور اپنا تک اسے نگہت یاد آگئی۔ نگہت فیروز پور میں اس کی سہیلی تھی جو ایک ہمت بڑھے مکان میں رہتی تھی۔ فاخران جب کبھی اس کے مکان میں جاتی تھی تو نگہت باقی تھی، یہ میرے ابا کا کمرہ ہے۔ یہ اماں کا ہے، یہ غسل خانہ ہے۔ یہ بھائی جان کا کمرہ ہے، یہ ڈرائینگ روم ہے۔ اور فاخران شفات دیواروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے دوسرے کمرے میں گھومتی رہتی۔ نگہت سوڑ میں بیٹھ کر سکول جاتی تھی، دوسری سے بارنگ کی آواز سن کر وہ کھلے لپٹ کر نگہت آگئی ہے، اور اب وہ سوڑ سے اُترے گی اور اپنے کمرے میں چلی جائے گی۔ نگہت اُسے بتایا کرتی تھی، آج اس نے مرغ کو چاؤ دکھایا ہے، آج گھر میں ہرن کا گوشت پکا ہے اور آج اسے دو لال لال سیب ملے ہیں۔ یہ الفاظ سن کر اس کے منہ میں پانی بھرا آتا اور وہ تھوکنے لگتی جب نگہت اس کے پاس بیٹھتی تھی اور اس کی اُنکھیاں اس پر سہیلی کی نصیحتیں، کوٹ یا شلوار سے مس کر جاتی تو اس کے ذہن میں وہ تمام تصورات جاگ اُٹھتے جو اس نے ریشم اور کھواب کے الفاظ سن کر ان کی ادنیٰ شکل کے لباس میں قائم کر رکھے تھے۔ کتنے نرم، عظیم اور شفات ہوتے ہیں یہ کپڑے جہاں انگلیاں رکھو پسل جائیں اور اس وقت بھی آزادی کے بارے میں سوچتے وقت اس کی انگلیوں میں نگہت کے ریشمی کپڑوں کا لمس، اس کے ذہن میں چلاؤ کی لذت ایگر خوشیاد اس کی زبان پر مسیب کی فاشوں کی مٹھاس رہنے لگی تھی۔ وہ خیال کرنے لگی

کہ جب غریبوں کو آزادی مل جائے گی تو وہ اس کی ماں، اور اس کی بہن بھئیے پڑائے کپڑے نہیں پہنیں گی۔ رات کی باسی روٹیاں نہیں کھائیں گی۔ ایسی جگہ نہیں رہیں گی جہاں بارش کے وقت چھت میں سے پانی ٹپک ٹپک کے ہر طرف جمع ہو جاتا ہے۔ بلکہ وہ اچھے اچھے کپڑے پہنیں گی، انھیں کھانے کے لئے اچھی اچھی چیزیں ملیں گی، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُسے ہر روز صبح سویرے اُن قدر رات کی بچی ہوئی روٹی کھا کر لوگوں کے سامنے اُتھ نہیں پھیلانے پڑیں گے۔ تو آزادی کب ملے گی غریبوں کو؟ یہ بات اسے معلوم نہیں تھی۔ وہ سوچنے لگی اس شخص نے صرف یہ بتایا ہے کہ امریکا کو آزادی مل گئی ہے، غریبوں کو نہیں۔ اس نے یہ کیوں نہیں بتایا کہ غریبوں کو کب آزادی ملے گی۔ اسے یہ بھی بتانا چاہیے تھا، اب آٹے کا تو میں اس کا ہاتھ تمام لوں گی، اور اُس وقت تک نہ جانے دوں گی۔ جب تک وہ مجھے یہ بات نہیں بتائے گا۔ خیر وہ نہ آیا تو کریم ہی سے پوچھ لوں گی۔ وہ جمہور کو روٹی دینے کے لئے آیا کرتا ہے۔ کریم اس کے محلے میں رہتا تھا۔ اس کا نام مر گیا تھا اس لئے وہ جمہور کو فاختراں کے گھر میں آکر روٹی دے جاتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ ایک حد تک مطمئن ہو گئی۔ اور اپنا فرض ادا کرنے کے لئے کوٹھری سے باہر نکلنے لگی۔

جمہور کو جب وہ شام کے قریب جھولی میں پیسے منہاتے ہوئے اند جانے لگی تو اس کے رخ پر آمیز بھائی ہوئی تھی کہ وہ کریم سے آزادی کا سوال ضرور پوچھے گی مگر کوٹھری میں قدم رکھتے ہی اُسے رونے کی آواز سنائی دی۔ کبھی کبھی ماں دیکھ کر گالیاں دیتی تھی تو وہ بیچاری نہ پڑتی تھی، اور اس وقت بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ بہن کو روتے سن کر اس کی اپنی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک پڑتے تھے اور وہ بہن کو چُپ کرنے کی کوشش

کرتے لگتی ۔ اس وقت وہ ماں کے پاس بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا بے بے؟“

اس بے شرم کی ہنجی کو شرم نہیں آتی، جس بات سے منع کرو وہی کرتی ہے۔

”کیا بات تھی؟“ فاختاں نے پوچھا۔

”میں نے جب ایک بار کہہ دیا ہے کہ کریم آئے تو اس سے کھد کھا کر دو، پھر یہ اس سے کہیں بولتی ہے۔ وہ چٹا ہوا بدماش ہے۔ سارا دل رنڈیوں میں گھسا رہا ہے۔“

”میں نے اس سے کچھ نہیں کہا، وہ کہتا تھا زینو کیا حال ہے؟ زینو نے دوتے چمٹے کہا۔“

”چپ حرا بھادی کی چھو کر ی، بک کر رہی ہے۔“

دو دنوں لڑکیاں سہم کر چپ ہو گئیں۔ فاختاں کی بکھ میں نہ آتا تھا کہ ماں اتنا بڑبڑکیوں رہی ہے، مگر وہ ڈر کے مارے بول نہ سکی۔ اس رات فاختاں دیر تک خدا سے دعا کرتی

رہی، اللہ فرمیں کہ آزادی دیدے تاکہ کریم روٹی لے کر ہمارے گھر میں آئے ہی نہ اور نہ ماں بے چاری زینو کو گالیاں دے۔۔۔۔۔ آزادی کا خیال آتے ہی ایک بار پھر اس کی انگلیوں میں ریشمی کپڑوں کا مس اور اس کے داغ میں پلاؤ کا ذائقہ لہرانے لگا۔

”بس سو رہی تھی، وہ لہنا تھا اس کے شلفہ ہر رکھتے ہوئے بولی گھبراؤ نہیں زینو!

آزادی مل جائے گی۔“

زینو سوتے میں چونک اُٹھی۔

”ہائے، مجھے ڈرا ہی دیا ہے تو نے!“

”تو سو رہی تھی۔۔۔۔۔ اچھا سو جا۔ میں کہہ ہی تھی اللہ ضرور ہمیں آزادی دے گا۔“

”ٹھاک دے گا۔۔۔۔۔ بے بے کو نہ جانے کیا ہو رہا تھا ہے۔۔۔۔۔ اتنی

گایاں دین، اتنی گایاں دیں کہ —————

”میں نے سب کچھ اس وقت تک ہے جب تک آزادی نہیں ملتی غریبوں کو آزادی
آجائے گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تو نازکیوں نہیں پڑھتی؟“
بڑھتی ہوں۔ نہ پڑھنے دانی کہہ دیا۔

”کیجا — تو دعا مانگا کہ تیں اللہ فرج چل کر چلی آزادی دے۔“

اب سو رہا: خیر آ رہی ہے مجھے۔

دین سو کئی مگر خزاں ویر تک آزادی کے لئے دعا مانگتی رہی۔

سروے بڑھتی جا رہی تھی اور گھر میں ایک کھیل اور ایک لحاف کے سامرو دی روکنے
کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ کھیل کہیں کہیں سے پھٹا ہوا تھا، اور ماں یہی پھٹا ہوا کھیل اور
کر سوتی تھی۔ کئی بار زبردستی کہا تب بے تو ہمارا ہے، لحاف تو لے لے اور کھیل ہمیں دیے۔
مگر ماں مانق ہی نہیں تھی۔ خزاں کی اب یہ کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ پیسے حاصل کرے
چنانچہ وہ زمینوں کے ٹکڑے پر بھی باہر بھیجی اپنی کچھ پیسے اور مل جائیں اور لحاف کے لئے ذرا کچھ بھی
نکل آئے۔ روز جتنے پیسے جمع ہوتے تھے ان میں سے آدھے پیسے لحاف کے لئے محفوظ
نہلے جاتے تھے۔ پہلے بروز سالن مزدور بناتا تھا، مگر اب سہل کے ساتھ ہی موٹی کمالی
جاتی تھی، اور سالن کے پیسے بھی بچائے جاتے تھے۔ خزاں اپنی زندگی کو کچھ اہم سمجھنے
لگی تھی کیونکہ اسی کے ٹکڑے جو شے بیسوں سے تین بیٹ بھرتے تھے، اور لحاف خریدنے کے
لئے پیسے بھی جمع ہو رہے تھے۔ اس احساس نے اس کے اندام کام کرنے کے بند بے کو اند تیز
کر دیا، اندامات دل وہ آئی بنیاں میں غلطان رہنے لگی کہ کب گھر میں لحاف آئے گا اور کب
اس کی بیماریاں سروے سے گزر جائیں گی۔

جب معقول رقم جمع ہوگئی تو ماں زیادہ بیمار ہوگئی، اس وقت جو کچھ لحاف کے لئے جمع کیا گیا تھا وہ دوا دارہ پر خرچ ہونے لگا۔ چند دن میں گھر کی عمارت پر بھی خرچ ہوگئی، اور اس کے ساتھ ماں کی زندگی کا اثاثہ بھی ختم ہو گیا۔ ماں مرگئی تو دونوں لڑکیوں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اللہ وہ سلوائی ہیں نے ناخراں کی ماں کے مرنے پر کھن دفن کا انتظام کیا تھا۔ آپنی بیوی اور بوزرھی بہن سمیت ناخراں کے یہاں آگیا۔ اب ناخراں کو بھیک نہیں مانگنا پڑتی تھی، کیونکہ گھر کا سارا خرچ اللہ دتہ پر ادا کرتا تھا۔

ناخراں ہپ ہپ ایک کونے میں بیٹھی رہتی تھی اور کسی سوچ میں غرق رہتی تھی۔ سوچتے سوچتے کبھی چہرے کا رخ بھت کی طرف پھیر لیتی اور کبھی اس کے ہوتوں پر ہنسنا شروع کر دیتے تھی۔

اللہ دتہ کو دل کے دورے پڑتے تھے۔ جب دورہ پڑتا تھا تو بیلہ زود ہر جاتا تھا، اور دو دو تین تین دن تک دکان پر نہیں جاسکتا تھا، معمولی سکیموں ڈاکٹروں سے کئی مرتبہ علاج کروا چکا تھا، مگر فائدہ نہیں ہوا تھا۔ لوگ کہتے تھے تمہیں کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیئے۔ لیکن اس کی محدود آمدنی بڑے ڈاکٹر کے پاس ہانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ ناخراں کے گھر میں اگر دورہ پڑا تو اس کے پاس معمول ڈاکٹر کے پاس ہانے کے لئے بھی پیسے نہ تھے۔ اللہ دتہ کی بیوی نے اپنی سوسے کی انگریز انگوٹھی بھی بیچ دی۔ ڈاکٹر کو گھر پر لایا گیا۔ مریض کی حالت میں کچھ افادہ بھی ہوا مگر یہ افادہ عارضی تھا، کیونکہ تیسرے دن چار بجے کس عورتوں کا یہ واحد سہارا ٹوٹ گیا۔

چار بیٹ روٹی سے محروم ہو گئے اور چار تنہا اپنی عریانی پھیلانے کے لئے کپڑے کو ترسنے لگے۔

مرحوم اللہ دتہ کا ایک بھائی کراچی میں رہتا تھا، اسے جب اس حادثے کا علم ہوا تو وہ چالیس روپے ماہانہ بھیجنے لگا۔ اس طرح گزارہ ہونے لگا۔

ایک دن فاخران اندرائی تو اسے بن کی سسکیاں مٹاتی دیں۔ چندویں سے وہ اس کو پریشان محسوس کر کے پریشان ہو رہی تھی، اور اب تو یہیں نورستے دیکھ کر اس کا کچھ بچھٹنے لگا۔ فاخران نے اس کو بلایا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔
اللہ دتہ کی بیوی گریو کر رہی —

’اے کیا کہتی ہے فخر! یہ تو فواب زادی ہے فواب زادی۔ دماغ مر رہا ہے کیا ہے بھتی
یہی نہیں کچھ۔ عزیزی میں یہ فوابی کیسی دیکھیں نہ سہی۔

’کیا فوابی ہے خالد چنان؟‘ فاخران نے آنسو روکتے ہوئے کہا۔

’یہ فوابی شان نہیں تو اور کیسے، کہتی ہے میرا بخش سے نکال نہیں کر دو گی میرے
دادا جتنا ہے، تو یہ! اس کی تو آنکھ کا پانی مر گیا ہے کوئی بچہ اس طرح گزارہ کیسے ہو گا کوئی
اس فواب کی بھوک رو اور اندھی اس کو روٹی دے گا۔ میں پوچھتی ہوں روٹی کپڑے کا کیا
بندوبست ہو گا؟‘

’خیر خالد جان! ———— تو کیوں ہماری فکر کرتی ہے ———— جس طرح ہر گا گزارہ
کر لیں گے، ذہیز روتے ہوئے رہی۔

’گزارہ کر لیں گے ———— کس طرح گزارہ کر لیں گے۔ آسمان سے اُترے گا سن و سلویٰ تیرے
لئے۔ اندھی اس کو کب تک بھیک مانگے گی، میں نے تو اسے منع کر دیا ہے۔ اس میں ہمدردی
بے عزتی ہے، ہم یہاں نہ ہرستہ تو جھوٹ میں آنا کرتیں۔ پر اب ہم لڑکی کو بھیک نہیں مانگتے دیکھتے۔
اللہ دتہ کی بیوی تڑپ کر رہی۔

نہ تو سمجھتی کیوں نہیں؟ اپنی حالت دیکھ، اتھ گنگال کو کوئی بیوی بنائے گا۔ اللہ دتہ کی بہن بولی۔

خزاہ کچھ ہر تجھے میرا بخشش سے نکاح کرنا ہو گا؟

اللہ دتہ کی بیوی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ زینو سسکیاں لیتے لیتے خاموش ہو گئی۔ مگر خزاہ کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ ماں کی موت کا خاموش غم، اپنی بے چارگی اور جن کا ڈنک۔ یہ تینوں احساس ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اس کے دل و دماغ پر ٹوٹ پڑے اور اس کی بے نور آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جسنے لگا دیر تک بہتا رہا، آخر بہن نے اسے پیچھے لگا لیا۔ نہ وہ بہن غریبوں کو آزادی ملنے والی ہے، اللہ غریبوں کو ضرور آزادی دیگا اور اس کے بچتے ہوئے آنسو روک گئے۔

چند دن کے بعد زینو گھر میں نہیں تھی۔ اللہ دتہ کی بیوی اور بہن اس کے لئے سخت بُرے اظہار استعمال کر رہی تھیں۔ اللہ دتہ کی بیوی کہہ رہی تھی "زینو حرام زادی نے اپنا منہ کاٹ کر لیا ہے، کریم کے ساتھ پہلی گئی ہے۔" اور اللہ دتہ کی بہن کہہ رہی تھی "مجھے پہلے ہی تھا، یہ لڑکی غافلانہ کوڑبو کر رہے گی۔ خود کو زاب زادی بکھ رہی تھی، آخر وہی ہرانا، ہی ملے تو میرا بخشش سے نکاح نہیں کرتی تھی۔"

گھر میں جو حرمت بھی آتی تھی زینو کو ضرور گالیاں دیتی تھی۔ ماماں کی بکھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ مگر وہ یہ غموس کر رہی تھی کہ اس کی بہن نے کوئی نہایت بُری حرکت کی ہے۔

بہن کی جدائی رفتے اس کا بُرا حال کر دیا۔ سمجھ کبھی وہ اللہ دتہ کی بیوی سے کتنی مضطرب

زیادہ نکماں ہے، اچھے وہاں بیچ دو، تودہ کابلوں کی بوچھاڑ شروع کر دیجی، ماماں کے لئے چُپ رہنے کے سوا کوئی چارہ مہکار نہیں تھا۔

وقت کا پستہ اس کے نحیف جسم کو چکلتا ہوا گزرا رہا تھا۔ اور وہ خاموش تھی۔ چپ
چاپ اپنا اندھی آنکھوں سے خلا کو ٹھورتی رہتی۔ چپ چاپ کنگیز کا انتظار
کرتی رہتی۔ ایک دن اس نے سنا کہ ایک عورت اللہ دتہ کی بیوی سے کہہ رہی تھی۔
زیرِ جلی ہے۔

یہ سنتے ہی اللہ دتہ کی بیوی زیرِ کوبے نقطہ سناٹے لگی۔ فاختراں کی کھد میں کچھ نہ آیا۔
اور رات جب وہ چار پائی پر لیٹی تو دودھ کر دھا کرتی رہی، اللہ مجھے میری اس سے ملا دے
اس کی یہ دعا قبول ہوگئی، کیونکہ ایک بھینٹ کے بعد وہ بوئنی گھر سے باہر بیٹھی تھی کہ کسی نے
اس کا کندھا پکڑ کر کہا۔

چل تجھے تیری بس بُھاتی ہے:

زیرِ جلا وہ بے تاب ہو کر دی۔

”بس“

اچھا! — مجھے لے جو:

کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے ٹانگے میں بٹھا دیا گیا۔ اور جب
ٹانگہ کہیں رُکا تو وہ زیرِ کی گرد میں تھی۔

ہائے، تو مجھے چھوڑ کر کہیں آگئی تھی زیرِ:

تو اچھی ہے نا تو:

میں ابھی ہوں یا نہیں تجھے کیا، تو تو مجھے چھوڑ کر آگئی تھی — وہ سب لوگ

تجھے گایاں دیتے تھے، تو کچ کل کیا کرتی ہے؟ ٹہنی میں کیا کرتی ہے؟
 — لوگ تجھ پر محنت بیجھتے تھے۔ حالانکہ تجھے پنجائیں دی تھیں —
 مر جائے۔

نرینک انہنوں سے آنسو بہہ رہے تھے، اور ناخراں ان آنسوؤں سے بے خبر تھی۔
 تجھے بھوک لگی ہے تو؟ ابھی نے پوچھا۔ یہ سن کر ناخراں تمام باتیں بھول گئی۔
 ہاں — کھانے کو کیا ہے؟

تو ہی اچھی اچھی چیزیں پکھاؤ کھائے گی نا؟
 پکھاؤ؟ — ہیں ازینو! اور یہ کہتے ہوئے ناخراں کا ہاتھ نرینک کی پیٹھ سے مس کرنے لگا۔
 یہ تو بڑی بھی تمسک ہے۔
 تو ہی ایسی نہیں پسندے گی؟
 اچھا۔

یہ ایک اس کے کانوں میں مڑھکے ہارن کی آواز گونج اُٹھی۔ اس کی
 انگلیوں میں شفات اور ملائم لمس جاگ اُٹھا۔ اس کے ذہن میں سوئی ہوئی طوطیوں کا
 ہونگنا — اور وہ خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی — تو زینو ٹہنی کے غریبوں
 کو آزادی مل گئی ہے — ہے نا —
 زینو نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

ناخراں کی اندھی آنکھوں میں طوطی کی لہریں ناچنے لگیں اور زینو وہ چہرے کے پلو
 سے اپنے آنسو روکھتی رہی نا۔

دروں تیرگی

کمرے کے سب دروازے، کھڑکیاں اور روشنائی ایک مدت سے بند پڑے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کمرے کے اندر فضا ہر وقت ایک بوجھل، سرد اور بھیاں بھیا تاریکی رہتی رہتی۔ اس گھر سے اندر صبر سے میں نہ تو کبھی سودرج کی سیات آفریں شمعوں نے سانس لینے کی کوشش کی تھی، اور نہ کبھی چاند تاروں کی ٹھنڈی روشنی نے اسے ہوا اٹھا۔ اور تو اور ہوا کی لہریں بھی کسی وقت اندر آنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ شاید انہیں بھی کمرے کی غسٹ آتا۔

یہ کمرہ زندگی کی تمام ہمد زائیں سے بالکل محروم ہو چکا تھا۔ اور اگر اس میں زندگی کا کوئی نشان تھا بھی تو صرف ان ننھے ننھے نظر نہ آنے والے ہزاروں ذرات کی بدولت جو ایک دیوار سے لے کر دوسری دیوار تک فضا میں دن رات سرکتے رہتے تھے۔ ان میں بھی حرکت اس وقت پیدا ہوتی تھی جب کبھی ہوا کی کوئی لہر یا سودرج کی کوئی لہر ان دروازے کے سودرج یا دیوار کی دراڑ میں سے اُترا جاتی۔ اس کے علاوہ ان میں کبھی کسی قسم کا اضطراب یا بوجھل نظر نہیں آتی تھی اور تاریکی کے جزوی کر رہ گئے تھے۔

ان میں انفرادیت نام کو باقی نہ رہی تھی! —

یہی ماحول طاری تھا کہ ایک دن اسی تاریک کمرے کے ایک تاریک ٹوکڑے میں

ایک بچہ، اس ذرہ مذہب حال ہو کر زمین کے بالکل قریب پہنچ گیا اور انتہائی بلندی کے عالم میں بولا۔

”تو ب، کس قدر اندھیرا ہے، کہیں بھی روشنی کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ نہ جانے کب اس سے نجات ملے گی؟“

یہ الفاظ سن کر ایک بوڑھے ذرے نے حضارتِ انجیلز قہقہہ لگایا۔

”خوب! ناچیز ذرے ہو کر روشنی کی سورج رسے ہو۔ بیٹا! ہم اندھیرے کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں، اس لئے ہمیشہ اندھیرے ہی سے وابستہ رہیں گے، ہمارا وجود تاریکی سے الگ نہیں ہے!“

”نہیں کبھی نجات نہیں ملے گی۔۔۔۔۔ کبھی اس اندھیرے سے باہر نہیں نکل سکیں گے!“ نضا ذرہ بولا۔

”کبھی نہیں۔۔۔۔۔ میری ماں ایسی بے ہودہ باتیں نہ سنا کرے۔ یہ کہیں بھول جاتے ہو کہ تم ایک حقیر ذرے ہو!“

یہ کہہ کر بوڑھے ذرے نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اور نضا ذرہ سہم کر خاموش ہو گیا۔ کچھ اور بچے چھنے کی اس میں ہمت نہیں رہی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں صرف ایک ہی دفعہ روشنی دیکھی تھی۔۔۔۔۔ اور اس وقت اس کا سینہ ایک شہید اور متحد تیز دلوں کی آہ بھگاہن گیا تھا۔ اس کی دگ میں ایک لذتِ انجیلز سنسنی سی ”ڈرگمی“ تھی، اور اسے پہلی مرتبہ محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک حقیر ہے مایہ وجود نہیں ہے۔۔۔۔۔ اپنی دنیا میں اس کی کچھ اہمیت بھی ہے۔۔۔۔۔ وہ کچھ کر بھی سکتا ہے، اس میں کچھ کر سکنے کی ہمت بھی ہے، اس کے

ماتھے ایک وسیع ایک روشن دُنیا پھیلی ہوئی ہے جس میں وہ پرواز کر سکتا ہے۔۔۔ ناچ سکتا ہے۔۔۔ اڑ سکتا ہے۔۔۔ گامتا ہے۔۔۔ مگر فوس اس وقت ہوا کے ایک جھونکے نے سے دروازے سے پیچھے دھکیل دیا۔ اور کچھ دیر کے بعد جب اس نے اپنا سر اٹھایا تو اس کے اندر گرد و بار بے کنار اور ہمہ گیر تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور اس کے جسم کا ہر عضو ٹری طرح دکھ رہا تھا۔ اس کے سارے سینے خواب چٹان کی طرح سخت اندھیرے سے ٹکرا کر پکنا چھ پر گئے تھے، اور بظاہر تاریکی سے نکل کر روشنی دُنیا میں جانے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ تاہم شدید سے شدید باریسی بھی اس مشعل کو بھانے میں کامیاب نہ کی جو ایک مرتبہ روشنی دیکھنے کے بعد اس کے دل کی گراہیوں میں جلی جلی تھی۔۔۔ اُسے قریع تھی کہ ایک ذایک دن وہ ضرور اندھیرے کی آنکھوں سے نکل کر باہر کی لامحدود دُنیا میں پہنچ جائے گا۔۔۔ اور وہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک اسی گھڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ بوڑھے ذرے کے سچ اور ہمت شکن الفاظ نے اس پر گہرا اثر کیا تھا، اس لئے کہ اپنے وجود کو منہمال نہ سکا اور زمین پر گر پڑا۔ چند لمبے خاموشی طاری رہی، وہ بے بس ہو کر انجمن ہو کر۔۔۔ چپ چاپ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اسی حالت میں یکایک بوڑھے ذرے نے حسب معمول کرخت لہجے میں کہا۔

”تمہارا خیال ہے گھر کی مالک پھر کبھی یہاں آجائے گی، اور کمرے کا دروازہ کھول دے گی۔“
 ننھے ذرے نے کوئی جواب نہ دیا۔۔۔ دراصل یہ الفاظ اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں سکے تھے۔ اور اگر وہ یہ الفاظ سُنی بھی لیتا جب بھی کچھ نہ کہہ سکتا۔ بالیہ سی نے اسے بے دم کر دیا تھا۔

”بزرگ ذرے نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔۔۔“

گھر کی مالکی کبھی نہیں آئے گی، یہ خیال اپنے دماغ سے نکال دو، اس زمانے میں گھر کا کچھ سامان یہاں بڑا تھا، اور وہ بھی سامان لینے کے لئے یہاں آگئی تھی، ورنہ وہ اس بڑے دہرے فضا میں کبھی آنے کا ارادہ نہ کرتی۔ مٹا بیٹا! تم سن نہیں رہے کیا؟
 ذرہ خاموش تھا۔

غائب کہاں ہو گئے ہر بزم۔۔۔ اچھا بھئی تمہاری مرضی، میں کیا کر سکتا ہوں؟ بڑے ذرے کی برقی آواز ایک لمحے کے لئے تھر تھرائی، اور پھر گہرے اندھیرے میں جھب جھب کر کے کچھ دیر گزرنے پر نئے ذرے کا شعور بیدار ہونے لگا۔ اُسے وہ واقعہ تمام جزئیات کے ساتھ یاد آ گیا جن سے وہ ابھی ابھی دوچار ہوا تھا۔ اُس نے بزرگ ذرے کی آواز نہیں سنی تاہم وہ ابھی طرح جانتا تھا کہ اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے ذرے کس انداز میں سوچا کرنے میں لور روشنی کی قنا کو کتنا بے ہودہ خیال تصور کرتے ہیں۔

قدوں کی ڈینا کا یہ سب سے نفاذ و جد چند لمحے سلسلِ حرمت و مایوسی کے عالم میں ابھر کر دیکھا رہا۔ وہ پوری طرح مایوس ہو جانا چاہتا تھا، مگر ہو نہیں سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خلش سی، ایک اضطراب سا موجزن تھا۔ اس خلش اور اضطراب میں روشنی کی آرزو کے علاوہ ایک قسم کا باغیانہ اس میں بھی کارفرما تھا۔ اپنے آپ کو وہ اس قدر حقیر نہیں سمجھتا تھا کہ ایک تر زمین پر گر کر دوبارہ اُٹھنے کا نام ہی نہ لے، اور روشنی کی قنا کو ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دے۔

اس سے بہت دور کافی بلندی پر اندھیرے کے سینے میں روشنی کی ایک نہایت دم سی ننھی سی کیر لندہ بھی تھی، اور یہی کیر اس کی نظر کا مرکز بن گئی۔ — — — صرف مرکز بن گئی۔ بلکہ اس کے اندر زندگی کی نئی آگ اور نئی تریک بھی پیدا کرنے لگی۔ — — — وہ مایوسی کی سطح سے بلند ہو رہا تھا، اور سوچ رہا تھا۔ — — — آخر کھرد لائے اس کو

کی کھڑکیاں اور دروازے کھول کیوں نہیں دیتے، انھیں ہم سے کیا دشمنی ہے، وہ ہمیں کیوں اس محدود فضا میں بند کر کے روشنی سے محروم کر رہے ہیں۔۔۔۔۔؟

کافی دیر کے بعد وہ گرتا پرتا اور پراگیا اب وہ اپنے سامنے بزرگ ذرے کو دیکھ رہا تھا، وہ بوڑھے سے یہ سوال پوچھنا چاہتا تھا مگر اس خیال سے کہ بوڑھا اسے بائوس کرنے لگا۔۔۔۔۔ اسے بولنے کی ہرأت نہ ہوئی۔

بزرگ وہ اس کا خیال بھانپ گیا اور کہنے لگا

میں نے ایک دفعہ کہہ دیا ہے کہ ہم تاریکی کا ایک حقیر حصہ ہیں۔۔۔ آخر سورج روشنی کے ساتھ ہمارا کیا واسطہ! تم بالکل نئے جڑے فائدہ اس پنجرے کے لئے بے تاب ہو رہے کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ میری ماں، اس قسم کی خیال نہ کیا کرو۔ سنا تم نے بیٹا!

ننھا ذرہ اب خاموش ذرہ رہ سکا۔ جھٹ بول اٹھا

وہ لوگ دروازہ کھول کیوں نہیں دیتے، دروازہ کھلے گا تو روشنی خود بخود اعدا ہجائے گی!

نہت خوب بھٹی! بزرگ ذرے نے خوفناک قہقہہ لگایا تم انسان سے یہ توقع کتنے

ہو کہ وہ تمہاری بے تابی کا خیال کر کے دروازہ کھول دے گا۔ یہ تمہاری بھول ہے، تم نے انسان کو

بکھا ہی نہیں۔۔۔۔۔ اسے ہم حقیر ذروں کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ اگر تم نے اس خواہش

کو دماغ سے نہ لگایا تو ایک دن تمہارا دم گھٹ جائے گا، اور تم مر جاؤ گے!

اس وقت ذرے کی آنکھوں پر بایوس کے سائے چھا گئے۔

تاریک فضا اور تاریک ہر گئی، روشنی کی وہ نغلی کبیر بھی نہ ملنے کہاں غائب ہو گئی ذرے

کا دم بچ بچ گھٹنے لگا۔ اُس نے اپنے آپ کو ہوا میں پھوڑ دیا۔۔۔۔۔ اس حالت میں اسے

کچھ خبر نہ تھی کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے، اند کیا ہونے والا ہے۔۔۔۔۔

پستی سے لے کر اتنا فی بلندی تک چاروں طرف گہری تاریکی مسلط تھی، اس تاریکی میں اس کے بزرگ، اس کے ہم عمر، لاکھوں ذرے اپنی مختصر سی دنیا میں گردش کر رہے تھے۔ آگے بڑھتے تھے، ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے اور پھر نیچے چلے جاتے تھے، ان میں کوئی ایسے بھی ہوں گے جنہیں روشنی کی تہا ہوگی، جو وسیع اور روشن دنیا میں پرواز کرنا چاہتے ہوں گے ان کی خواہشیں سبک سبک کر دم توڑ دیتی ہوں گی، اور نوجوان ذرے بھی محسوس کر رہا تھا کہ راستے کی مشکلات کا مقابلہ کر کے دوزارے تک پہنچ جانا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ پہلے بھی اس نے اوپر جانے کی کوشش کی تھی، مگر طاقتور ذروں نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔۔۔۔۔ وہ ایک بے وقوف اور ضدی بچے کو گات آفریں ٹگ دو سے بچانا چاہتے تھے۔۔۔۔۔ کم از کم ان کا نقطہ نظر یہی تھا، اور ان کی باتوں سے بزرگانہ شفقت نمایاں تھی۔

”کیا وہ اسی طرح ختم ہو جائے گا۔۔۔۔۔ اس نے سوچا اور روشنی کا تصور پوری شدت کے ساتھ اس کے دل میں جاگ اٹھا، اور دھپنے اندر ایک نئے دلولے کا جہان محسوس کر کے بلندی کی طرف پرواز کرنے لگا۔

نئی فضاؤں میں گردش کرتے ہوئے ذرے جب اس سے ٹکراتے تو وہ ایک دم کہیں سے کہیں جا بچتا۔ ایک مرتبہ تو وہ اسی پستی میں پہنچ گیا جہاں سے نکل کر وہ اوپر اٹھا تھا۔ اگرچہ وہ چند لمحے وہاں ٹھیرا لیکن اس مختصر سے وقفے میں بھی اس کے بزرگوں اور ساتھیوں نے طعن و تشنیع سے اسے پریشان کر دیا۔

ایک بزرگ کہنے لگا۔

”تو کیوں ابھی بے ہودہ حرکت نہ کر رہا تم نہیں جانتے کہ۔۔۔۔۔“

اس نے پہلے کہ بزرگ کا غزوہ مکمل ہو وہ تیزی سے اوپر کے کوسے میں اُٹ گیا۔

خوش قسمتی سے ہوا کا ایک جھونکا اُدھر آ لگا اور اس جھونکے نے اُسے فضا کے اُس جھے میں پہنچا دیا جو کافی بلند تھا، اور جہاں وہ پہلے کہیں نہیں پہنچا تھا۔ یہاں پہنچ کر بزرگ کو اس نے نیچے دیکھا، اور اس کے پست ہمت ساتھی کلبا رہے تھے، اور اپنی محدود تاریک دنیا میں بے سنی گردش کر رہے تھے۔ یہاں سے اپنا پہلا مقام اُسے اس قدر پست نظر آیا کہ وہ اپنی کامیابی بدحیران رہ گیا۔ مگر حیرت دوسرت کے یہ لمحے بہت جلد ختم ہو گئے۔ کیونکہ اب وہ جن قدروں کے درمیان موجود تھا وہ اسے اپنا ساتھی نہیں سمجھنے لگے تھے بلکہ تاریک پستیوں کا باشی کہتے تھے، اور اسے اپنے کُرسے میں آنے کی لہذا ت دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب اس نے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو اسے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ اس نے ساتھی بھائے اس کے کہ اس کی ہمت و عزم پر تعجب کہیں اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ایک دُور سے قاصات صاف کہہ دیا۔

تجبی! یہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ یہاں تک پہنچ سکے، چاہے تو اس چلے جاؤ تمہارا مقام اس پستی میں ہے جہاں سے تم اُسے ہوا اگر ہم میں سے کسی طاقت و در وجود سے تمہارا تعادم ہو گیا تو ایک ہی لمحے کے اندر فنا ہو جاؤ گے، یا زخمی ہو کر نیچے گر پڑو گے اور پھر یہی کے قدروں میں جذب ہو کر نہ جاؤ گے، اور پھر کبھی تم نہیں اُٹھ سکو گے!

باقی قدروں نے بھی یہی کوشش کی کہ وہ ایک لمحہ توقف کئے بغیر واپس چلا جائے لیکن وہ تھکاوٹ کے باوجود اوپر جاسنے لگا، یہاں تک کہ ایک قویٰ بندی ہر پہنچ گیا۔

اس بندی پر اس کی طاقت ایک تیز و مسافر سے ہو گئی، یہ ذرہ بھی اسی کی طرح ایک دُور واز کو شے سے شعل کر بالائی تھنے کی طرف پر تازہ کردہ تھا چنانچہ خوشی خوشی اس کا مسافر گیا

ایک دن وہ دونوں ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے کہ یکایک اس کا ساتھی بچ بچا۔
 ”آندھی“

کیا؟ تو جو ان فذہ آندھی کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔

”باہر آندھی آ رہی ہے۔ یہ خود سن رہے ہو نا!“ اس کا ساتھی بولا۔

”جیسے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ باہر وسیع دنیا میں بھی اندھیرا چھا گیا ہے۔ اتنی جلدی رات کیونکر آگئی ہے آج؟“

اس کے ہم سفر نے بتایا ”آندھی تیز دھند ہوا کہتے ہیں، اگر چہ کمرے کے سب دروازے بند ہیں، تاہم آندھی کے جھوکے اندھ بھی آجاتے۔ گئے، اور اگر ہم کسی جھوکے کی زد میں آگئے تو وہ نہ جانتے ہیں کہاں پھینک دے اور۔۔۔ یہ بھی خبر نہیں کہ۔۔۔“
 یکایک ادھر ادھر ایک پہل سی چلی گئی۔۔۔ ایک طوفان سا رہا ہو گیا۔ چھوٹے فذے نے غموس کیا کہ سب فذے مل کر اسے پستین کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ خوف سے اس نے آنکھیں بند کر لیں، اور اس کا تنکا ہوا وجود اس طرح گردش کرنے لگا جیسے کسی طاقت ور چیز کے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکے۔

کافی دیر کے بعد جب وہ ذرا سمجھلا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک جگہ کے سرے پر چمٹا ہوا ہے، اور یہ تنکا دروازے کی طرف جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ دروازے کے ساتھ جاملے۔۔۔ فضا میں ابھی تک اندھیرا مستحضر تھا، اور لہو بہ لہو گرا ہوا جا رہا تھا۔ اس کے ارد گرد جتنے فذے موجود تھے وہ سب کے سب تنک کر۔۔۔ سو رہے تھے۔۔۔ ایک جڑا ملاس گئی خیال اس کے ذہن میں آیا۔۔۔ کیا میری زندگی حرکت اور حرارت سے محروم ہو گئی ہے، اور کیا میں اپنا سفر بردار کے پھر اسی ناہید اکثر تارکی کا جزو

تجھ انسو کس ہے میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا، دیوار کے ساتھ جالا لٹک رہا ہے میں اس میں بڑی حرج پھنس گیا ہوں، نہ ہانے کب تک یہاں گرفتار رہوں گا۔ ایک نہ ایک دن کہیں سے جہاں کا بھونکا آئے گا اور مجھے اس قید سے رہائی دلا دے گا۔ جب تک وہ بھونکا آئے میں اس پر بھل خیال سے نہیں دھل سکتا۔

’کوشش تو کرو!‘

’کوشش تو کرتا ہی رہوں گا، تم تمہارا روشنی کی تلاش میں نکل جاؤ۔ میں بھی نہ کبھی میں بھی آ جاؤں گا۔ ضرور آؤں گا۔‘

’نہیں بھوب تک تم ساتھ نہیں چلو گے میں نہیں رہوں گا۔ یہ کہتے ہوئے چھوٹے دتے کا دل ہمدرد کیسے لبریز ہو گیا۔‘

دوسرا دنہ بولا اس کا خیال نہ کرو، اس وقت فضا کافی بڑے سکون ہے۔ توہیں راستے میں زیادہ تکلیف نہیں ہوگی، دوسرے قدم کے لیے میں عزم اور ارادے کی مضبوطی جھانک رہی تھی۔ اپنے ہم سفر سے عودمی کے احساس نے اس کے سینے میں درد کی لہریں دوڑا دیں اور اُس کے ذہن میں ایک چٹھیں سی ہونے لگی۔

’نہیں، ٹھہر جاؤں یا روانہ ہو جاؤں‘ — وہ سوچنے لگا۔ اس وقت فضا واقعی پر سکون تھی، اور وہ مجبوری پر تکی کی پیشانی سے روشنی کی ایک لہر چھوٹ رہی تھی۔

’اُس نے اپنے ساتھی کو آخری بار دیکھا اور اوپر پرندوں کے اُڑنے اور ایک فضا میں گر کر گر کر اُڑنا دہا، اُڑ کر اُڑ کر گرنا رہا۔‘ کہیں طاقت و قوتوں سے ٹکرا کر باطل زمین کے قریب پہنچ جاتا اور کہیں مسلسل تک و دو سے کسی نئی فضا کو چھونے لگتا، نئی فضا کے قدم اسے حقیر اور اہمیت بخش کر — اپنی دنیا سے نکال دیتے، نگہ

قدوسے اس کا راستہ روک لیتے، اس کا مذاق اڑاتے، نہ صرف یہ بلکہ اسے زخمی کر کے نیچے بھی گرا دیتے۔ ہر لمحہ برحق ہوتی مشکلات کو دیکھ کر اس کے اوسانِ خطا ہوجاتے، اس کی ہمت جواب دے جاتی، لیکن اس کے دل میں روشنی میں جلنے کی جوتنا بے قرار تھی اس کا شعلہ کسی صورت میں بھی، کسی حال میں بھی نہیں بجھتا تھا۔ یہی وہ شعلہ تھا جس کی حرارت نے اسے ہر لمحہ مصائب کے جہنم میں بھی سرگرم سفر دکھاتا تھا اور ہر گھڑی ایک حسین، ایک شاداب دنیا کے خواب دکھاتا رہا تھا، جب کبھی زخمی ہو کر زمین پر گر پڑتا تو یہ رنگیں خواب چپکے سے اس کے ذہن میں جھلکنا اٹھتا اور وہ اسی حالت میں اپنے بیخروج جسم کے ساتھ اوپر اٹھنے کی کوشش کرنے لگتا۔

وہ اڑتا رہا ————— یہاں تک کہ ایک دن اس کی آنکھیں حیرت انگیز مسرت سے کھل کی کھل رہ گئیں۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ کیفیتِ اندھیرے کی مدھی ختم ہو رہی تھیں۔ اور اس کی فضا بھی آنکھوں کے سامنے دور تک روشنی اور تاریکی کا ایک وسیع پھیلاؤ سا نظر آ رہا تھا۔ جس میں لاکھوں صحت مند ذرے ناچ رہے تھے۔ اس پھیلاؤ اور اس کے درمیان ابھی تاریکی مائل تھی ————— وہ ٹھیر نہ سکا، اتنی ہی سے آگے بڑھنے لگا ————— برابر آگے بڑھتا گیا۔

اب اس پر ایک نیم بے ہوشانہ سی کیفیت طاری رہی۔

وہ کہاں ہے، کس دنیا میں پہنچ گیا ہے، کیا وہ سنگین دروازے سے باہر نکل آیا ہے:

یا ابھی تک اسی دم گھٹنے والی تاریک نفا میں لڑکھڑاہے — اُسے کچھ سمجھتا نہیں تھا — کچھ دیر کے بعد وہ اپنے نئے ماحول سے آشنا ہونے لگا — اس کے چاروں طرف ایک نئی دنیا بکھری ہوئی تھی — ایک نئی دنیا جس میں روشنی بھی تھی اور وسعت بھی، جو بڑی شاداب اور بڑی خوبصورت تھی۔ اسے روشن دنیا کے دوسرے بڑے ہمدرد نظر آ رہے تھے، کیونکہ ان کے صحت مند چہروں پر ایسی اور انسانی نہیں تھی، بلکہ مسکراہٹ کی سرخی پھیلی ہوئی تھی، اور اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کا استقبال کر رہے ہیں، اپنی کامیابی سے سرشار وہ روشنی کے چشمے میں تیرتا رہا — یہاں تک کہ شک گیا۔ — اچانک ایک دم تاریکی چھا گئی۔

اس نے حیران ہو کر ایک دوسرے سے پوچھا۔

”روشنی کہاں گئی؟“

نئے قدم سے جواب دیا

اب شام ہو گئی ہے، کمرے کے باہر وسیع دنیا میں روشنی کا منبع یعنی سورج اپنی کرنیں سمیٹ کر جا رہا ہے۔ — تھوڑی دیر کے بعد چاند اور ستارے نکلیں گے۔ — تھوڑی سی روشنی اندر اٹھنے کی — آہ خوبصورت اور پیاری روشنی تو باہر ہے — باہر کی وسیع دنیا میں۔

میں اسی وسیع دنیا میں جانا چاہتا ہوں۔ — چھوٹا ذرہ بولا اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔ آگے ہوا کے بڑے تیز رفت قہریرے ہیں جو، ہیں جیسے دھکیل دیتے ہیں باہر جانا ممکن نہیں۔

”مگر وہ دیکھو باہر جانے کا راستہ تو ہے۔ —

دروازے میں — ”وہ بولا۔

”راستہ ہے تو لیکن باہر نکلتا بہت مشکل ہے۔ وہاں ہوا بہت تیز ہے۔“

گوئی پروا نہیں — میں باہر جاؤں گا — میں باہر کی مہتری اور

روشنی دُنیا میں ضرور جاؤں — ضرور جاؤں گا۔“

اوپر کہتے، سمیٹے وہ پھر ہدواز کرنے لگا، اوپر ہی اوپر — بلند سے

بلند تر فضا میں ! ۛ

ایک مصنف

جب سے مصنف نے بھیجے جانے کا ارادہ کیا ہر کیا تھا اس کے دوستوں اور عقیدت مندوں کے خطوط کا سلسلہ ختم ہونے میں آتا ہی نہیں تھا۔ ہر ڈاک سے کم از کم دو خط ضرور موصول ہوتا تھے۔ وہ ہر خط کو ایک خاص عالم مسرت میں پڑھتا تھا، اور پھر لٹا دینے میں بند کر کے حفاظت کے ساتھ الماری میں رکھ دیتا تھا۔ دوستوں کے علاوہ جن لوگوں کے ساتھ اسے ایک قسم کا قلمی تعارف حاصل تھا وہ بھی اس کے انتظار میں اپنی آنکھیں فرشِ راہ کے ٹھٹھے تھے۔ اور اسے اپنا سماں بنانے میں فخر محسوس کر رہے تھے۔ اسے ان ہستیوں کے خط بھی ملے تھے جن کے نام اس نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے، مگر جو اس کی ذہنی کاوشوں کے دل و جان سے قدردان تھے۔

قدردانوں کا ایک شدید احساس مصنف کی رگ و پے میں گہرا پام تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ عام فنون کی سطح سے وہ یقیناً بلند ہے وہ ایک بلند پایہ مصنف ہے اور دنیا میں ہر ذہین شخص مصنف نہیں بن سکتا۔ پندرہ دن کے بعد اس نے الماری کا دروازہ کھولا۔ تمام خطوط نکالے اور ایک شدید احساسِ عظمت کے ساتھ انہیں میز پر پھینک کر خود آرام کر سی میں لیٹ گیا۔ بے حدوی کے عالم میں وہ رمانچ کے ان مقتل دروازوں کو کھولنے لگا جن کے پیچھے اس کا کمری کی اندھیری کوٹری ہیں مدت سے اس کے دلوں کی دنیا بسک بسک کوم

قذری تھی۔ ان دلوں میں یک بیک ہی سی پڑ گئی، جیسے ہمارے ہی سوکھے پودوں میں
 شگھل کی طرح چھا جائے یا جیسے سوکھنڈی میں یکا یک کہیں سے پانی آجائے۔ اس کی اسکل
 کی تو بہت مزاج یا دوسری کے زہریلے دھوئیں میں سے ابھرنے لگی۔ اور اس کے اپنی حیات
 پر مدد پرش کو رنگینیاں چھا گئیں، اس کے سامنے میز پر خطوط کا انہار پڑا تھا، ان خطوں
 میں پکتے ہوئے حیدر رنگ کے لفظ بھی تھے، اور کچے گلابی رنگ کے نہیں خط بھی،
 اور دو چار ایسے بھی تھے جس کی پیشانی پر ملک کی مشہور کاروباری فرموں اور عظیم کمپنیوں
 کے نام لکھے تھے۔ وہ سوچنے لگا، ان خطوں کی موجودگی میں یہ خیال کرنا کہ مصنف
 کی کوئی قدر قیمت نہیں ہے ایک خوفناک غلط فہمی ہے۔ اس کے بلند پرواز افکار و تصورات
 نے ایک دنیا کو سحر کر رکھا ہے۔ بے شمار لوگ اس کے علاج ہیں اور انتہائی بے صبری
 سے اس کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ یہ خیال کر کے خاص طور پر خوش تھا کہ اب اس کی ذہنی
 غلامی کا زمانہ ختم ہو گیا، پچھلے دو چار روز کے بعد وہ آزادی کے ساتھ آزاد فضا میں سانس لے
 کر اپنی نئی زندگی شروع کرے گا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے نئی زندگی کا نقشہ گھومتے
 لگا۔ ابھی میں مستقل قیام، کسی فلم کمپنی سے باوقار وابستگی یا کسی تجارتی ادارے میں رہنمائی
 عہدہ، اور پھر کھنے پینے کے لئے کافی فرصت، ان کے علاوہ اُسے اور کیا ہائے تھا؟
 گزشتہ چار سال سے وہ دفتر کے ادب گنش ماحول میں کولہو کا بیل بنا ہوا تھا، اس کی محدود
 دنیا گھر سے شروع ہو کر دفتر کی دیواروں سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ مسلسل پندرہ سال سے وہ
 اس قسم کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ رات دو بڑے بڑے خاتونوں پر تھکنے کے باوجود صبح
 کے آغاز میں اس کے پاس اتنی رقم بھی نہیں ہوتی تھی کہ زندگی کی بنیادی ضرورتیں ہی پوری
 کر سکے۔ دفتر میں کئی گھنٹے گزارنے کے بعد جب وہ گھر آتا تھا تو اس میں اتنی ہمت نہیں ہوتی

گاڑی مختلف مشینوں پر دوک دوک کر رہی تھی، لوگ اس کے ڈبے میں آتے بھی اور چلے بھی جاتے، اگر وہ اور گرد کے حالات سے بے خبر ہوا ہے تو شکل و تصورات کے گہوارے میں جھول رہا تھا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ وہ سیکڑ گلاس میں سر کر رہا تھا، ورنہ عام طور پر تھوڑے گلاس میں سر کرنے کے لئے بھی اس کے پاس معقول پیسے نہیں ہوتے تھے۔ نرم نرم کچھ میں نیم دراز، اس نے اپنی آئندہ زندگی کے کئی پروگرام بنائے، کئی تجویزیں سوچ لیں، لوگوں کی کتابوں کے نام تجویز کر لئے، انھیں اس کو مستقبل قریب میں لکھنا تھا۔ جیسے ہی گاڑی دلدل مشین پر رکی، اس کا دل لیلیوں اُٹھنے لگا، کھڑکی کے قریب پہنچ کر اس نے باہر نگاہ ڈالی۔ اس کے دوستوں کا ایک مجمع اس کے ڈبے کی طرف آ رہا تھا، آج اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ گاڑی کے ڈبے ہی سے نہیں بلکہ زندگی کے تاریک اور گم گشتے سے نکل کر ایک وسیع میدان میں قدم رکھ رہا ہے۔ —

لڑائی سے اُٹتے ہی اُسے کئی لوگوں نے گیرے میں لے لیا۔ ان لوگوں میں ایچے انھیں بھی موجود تھے جو اس کے نام کی شہرت سن کر ان کے دوستوں کیساتھ استقبال کے لئے آئے تھے۔ کدو میں قدم اٹھانے والے وہ پہلے پہنچنے والے گمراہ تھے جن میں ایک گنگہنی سی عروس کر رہا تھا، ایک ایسی لذت انگیز لڑکی جس سے اس کا ذہن ہمیشہ محروم رہا تھا۔

بہشتی پہنچنے کو ذرا پہنچ گیا، لیکن اب ایک نیا مسئلہ اس کے سامنے تھا، جتنے لوگ اس کے انتہائی کے لئے آئے تھے سب کے سب اسے مہمان بنانے پر اصرار کر رہے تھے، اور وہ تھا کہ ہر ایک کے احسان کے نیچے دبا جا رہا تھا، اس نے اپنے ایک پرانے دوست کے یہاں قیام کرنے کی خواہش ظاہر کی، اور اس کا دوست اسے اپنی خوش قسمتی سمجھنے لگا۔ اس کا یہ دوست چند سال سے بیٹی کی غم کہانیوں میں نمایاں حصہ لے رہا تھا اور چند ماہ سے

وہ ایک نئی نظم کہنی کا حصہ دار بھی بن گیا تھا۔

پندرہویں تو مصنف اس قدر مصروف رہا کہ اپنی بیوی کو خیر و عافیت کا خط بھی نہ لکھ سکا۔ صبح و شام دھڑکتی ہوئی تھیں، مشہور لوگوں سے تعارف کرائے جارہے تھے اور اس کے اعزاز میں فی ہفتے دو مجلسیں ہوتی تھیں۔

دو تین ادبی مجلسوں میں اس کے ادب سے متعلق تقریریں بھی ہو چکی تھیں۔ اس کی دو کتابوں کو ادب کا زخمہ جاوید کا نام دیتا گیا تھا۔ رات دن اس کے یہاں دوستوں اور عقیدت مندوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، اور جب وہ انتہائی دلچسپ مصروفیات کے بعد چنگیز لیا تو دن بھر جو کچھ ہوا تھا اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔

ایک ہفتہ گزر چکا تھا، مگر ابھی تک بیٹی کے اخباروں میں اس کے متعلق خبریں شائع ہو رہی تھیں، آج فلاں جرنل میں فلاں صاحب نے مصنف کے اعزاز میں پارٹی دی اور آج فلاں فلم ڈراما کیئر نے اسے اپنے یہاں کھانے پر بلوایا۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا، یعنی پندرہ دنوں میں وہ اپنے متعلق کچھ بھی نہ سوچ سکا، آج اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کاغذ کا ایک ٹکڑہ باہر نکالا تو سنا اسے یاد آیا کہ وہ دفتر سے ایک ماہ کی چھٹی لے کر آیا ہے، اور یہ اس کی چھٹی کی درخواست کی نقل تھی لغت و تجارت کے ساتھ اس نے کاغذ کے اس ٹکڑے کو پھاڑ ڈالا، اور اسی وقت استغنی لکھ کر جیب میں ڈال لیا۔ وہ وہیں سے استغنی بھیج دینا چاہتا تھا۔

پانچ دن اور گزر گئے، اس کا میزبان اپنی کہنی سے متعلق کسی کام کی غرض سے پونا بلا چکا تھا۔ اور اب پہلے کی طرح اس کے پاس لوگوں کا ہجوم بھی نہیں رہتا تھا، اس لئے اُسے اپنے بارے میں سوچنے کا موقع مل گیا۔ اس کے میزبان کو اپنی کہنی کے لئے ایک نئے ہبلٹی

آئینہ کی ضرورت ہے۔ ہر پہلے کہ کام اس کے حسبِ مشائے ہے، اور اس کا میزبان اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کی طرف کیوں توجہ کرنے لگا، اس کے لئے اپنی کہنی میں گنہگار ٹکڑا لگاتا کہنی کے لئے ایک نگر انگیز امر ہے۔ مسٹر رضوی کو اپنی کہنی میں افسانہ نویس کی خدیہ ضرورت ہے، اور کیا ممبر رضوی اس کی خدمات سے فائدہ اٹھانا اپنی خوش قسمتی نہیں سمجھیں گے؟

رضوی کا مکہ چند روز سے اس کے حلقہٴ اسباب میں شامل ہوئے تھے۔ پہلی عادات ہی میں انھوں نے مصنف کے کئی طویل افسانوں کے پلاٹ سنا دیئے تھے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ وہ ای کی ایک کتب کو کم از کم چھ مرتبہ پڑھ چکے ہیں۔ انھاری صاحب ایک بہت بڑے ادارے کے روحِ حوا ہیں۔ انھیں ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو دن میں کسی وقت ان کے انگریزی اختارات کو اردو میں منتقل کر دیا کرے۔ مصنف سے بہتر آدمی انھیں اور کون مل سکتا ہے؟

اس نے کھرکی سے جھانک کر نیچے دیکھا، شرک پر رنگ بنگ خوبصورت گاڑیاں بڑی تیزی ساتھ ایک دوسری کے پیچھے بھاگی جا رہی تھیں، ہر چیز خوبصورت تھی، ہر چیز اُسے مانوس، معلوم ہو رہی تھی، جیسے وہ سا اسی سال سے اس شہر میں زندگی بسر کر رہا ہے، اور ان خوبصورت چیزوں کو روزانہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہتا ہے۔

دس دن اور گزر گئے، ملاقاتوں کی تعداد میں فرق ضرور پڑا، مگر جو بھی آتا تھا محبت اور محبت کے ساتھ آتا تھا، اور گفتگو اس کی ادبی تخلیقات کے بارے میں گفتگو کرنا رہتا تھا، گیارہویں دن اس کا میزبان پونا سے واپس آ گیا۔ آتے ہی اس نے شرمندگی کے ساتھ معذرت طلب کی کہ وہ اسے چھوڑ کر بلونا چلا گیا۔ کتنی گہری اور خدیہ محبت تھی اس کے میزبان کو اس کے ساتھ یہی باتوں کے بعد اس کا میزبان اسے بتا مارا کہ پونا میں اُس نے

کیا کام کیا ہے۔ مصنف اس کی باتوں کو بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ وہ یہ سننا چاہتا تھا کہ کہنی کے لئے ایک پبلشری آفیسر کی ضرورت ہے، اس کے لئے کیا لکھا گیا ہے۔ اس کے میزبان نے سب کچھ بتا دیا مگر اس معاملے کے متعلق کچھ ذکر نہ کیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے خود ہی پوچھا "ہاں تو وہ آپ کی کہنی کے لئے پبلشری....."

اس سے پیشتر کہ مصنف فقرہ مکمل کرے۔ اس کا میزبان بول اٹھا، ایک صاحب نظروں میں ہیں آپ کے بڑے مداح ہیں، کہتے ہیں آپ کی کتابیں پڑھ کر انہوں نے انشا پر وازی سیکھی ہے، کل پرسوں آئیں گے ضرور، اور یہ کہ کردہ نوکروں کو ہدایات دینے لگے کہ سہاں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

مصنف کے دل میں ایک طرفان رہا ہو گیا۔ ایک تیز رو اس کے ذہن میں ٹکرا رہی تھی اور لانا چاہتے تھے، لیکن اتفاقاً حلق میں آکر رک گئے۔ اب میزبان صاحب پرچھے کے پیچھے غائب ہو چکے تھے۔

میزبان کے جاننے کے بعد مصنف نے سوچا اس نے اچھا کیا جو مطلب کی بات نہ کی۔ پبلشری آفیسر ہونا معمولی بات ہے، یہ بھی کوئی عہدہ ہے، تنخواہ معقول ہے مگر اخباروں کے ایڈیٹروں کی خوشامد بھی تو رہنا پڑتی، اس سے آواز دی کب ملامت نہ ملتی، اور یہ سمجھتے ہوئے وہ اطمینان کے ساتھ چنگ پر ریٹ کر رہی تھیں سوچنے لگا۔ آج سید احمیہ پارک میں سے گزرتے ہوئے اس نے ایک خالی ٹیبلٹ دیکھا تھا۔ اس ٹیبلٹ والی جڈنگ کا مالک اس کا دوست تھا۔ مسعود غفر قوی۔ ٹیبلٹ دیکھتے ہی اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ یہیں رہے گا۔

دوسرے دن رضوی صاحب نے اسے چائے پر مدعو کیا۔ بیٹھی میں یہ پرانا موقع تھا کہ

رات کو جب وہ بستر پر لیٹا تو رضوی صاحب کے یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ”اتوار کو ضرور آئیے چند خاص باتیں کرنی ہیں۔“ یہ چند خاص باتیں کیا ہو سکتی ہیں، یہی کہ آپ میرے ادارے میں آجائیں۔ اور۔۔۔“

اس رات اس نے بڑا غور و فکر کیا اور خواب دیکھا۔

اتوار کو وقت مقررہ پر رضوی صاحب کے جگہ پر پہنچا۔ وہ جگہ سے باہر باغیچے میں ان کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ بڑے تکلف سے ملے۔ کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ادب سے متعلق گفتگو شروع ہو گئی، رضوی صاحب بڑے شوق سے مصنف کی باتیں سن رہے تھے، اور ساتھ ہی ساتھ ان کی زندگی کے حالات بھی پوچھتے رہتے تھے۔ رضوی صاحب دراصل مصنف کے حالات زندگی لکھا چاہتے تھے، یہ ان کی بڑی پہلوانی خواہش تھی۔ اور اب مصنف خود ان کے سامنے بیٹھا تھا، اور وہ اپنے محفل کے لئے مواد اکٹھا کر رہے تھے۔

رات کے گیارہ بجے تک باتیں ہوتی رہیں، مصنف کو یہ خیال ہی نہ رہا کہ ابھی رضوی صاحب کو خاص باتیں کرنا ہیں، اور اسے خاص طور پر اسی مقصد کے لئے بلا یا گیا ہے، جب گفتگو کا سلسلہ شروع کرنے کے لئے کوئی نیا موضوع نہ رہا تو ایک محنت مصنف کے ذہن میں ایک کاٹا سا جھنڈا لگا۔

ہاں تو وہ خاص باتیں۔۔۔۔۔ آپ نے کچھ اشارہ کیا تھا اس دن۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے ٹی پارٹی کے دن۔۔۔۔۔

یہ الفاظ کہتے ہوئے مصنف کی رگوں میں خون کی گردش رگ سی گئی۔ وہ سانس روک کر، پان دانتریں تلے دبا کر، رضوی صاحب کے بائیں ہاتھ کی انگلی میں انگشتری

کو دیکھنے لگا جس میں سُرخ رنگ کا ہیرا جھک رہا تھا۔

رضوی صاحب شکرتے "میں آپ کے بارے میں ایک مقالہ لکھنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ بڑی پُرانی آمد تو تھی میری۔ یہ مقالہ پڑھ کر قد ناشناس ہندوستانیوں کو معلوم ہو گا کہ ان کے جلیل القدر مصنف نے کس طرح غافلے کر کر کے ادب میں لادلائل اضافہ کیا۔ خدا کی قسم ہندوستان جیسا مردہ ملک ساری دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ مصنف کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر آواز اس کے گھے میں آکر ٹک گئی تھی۔ وہ ابھی رضوی صاحب کی انگلیوں کو دیکھ رہا تھا جو مگر بیٹ کی راکھ بھاڑ رہی تھیں۔

تیس آپ کی بڑا شکر گزار ہوں، شاید غیبہ آرہی ہے؟

رضوی صاحب نے مصنف کی خاموشی سے یہی اندازہ لگایا تھا۔ مصنف اٹھا اور چند لمحوں میں وہ جھلکے کے باہر کھڑا آخری بس کا انتظار کر رہا تھا۔ موٹر میں بھاگی جا رہی تھیں، بلند عمارتوں کی کھڑکیوں میں ہوا کے جھونکوں سے ریٹھی پر دے لہرا رہے تھے، دور سمندر کے سینے پر چھوٹی بڑی کشتیاں بے جا رہی تھیں۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ یہ سب چیزیں پہنچے ہیں دیکھ رہا ہے، وہ ایک اجنبی شہر میں کھڑا ہے جہاں ہر شے سے اجنبیت چمک رہی ہے۔

تین دن اور گزر گئے۔ اس نے سنا کہ انصاری صاحب نے اپنی فزم کے لئے ایک اخبار کے سابق نامہ نگار کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ اور مسٹر کار نے غلطی اضافہ کرنے کے ذرائع تھیرٹر کے ایک پُرانے ایکٹر کے سپرد کر دیئے ہیں۔

چھبیس ختم ہو چکی تھیں۔ اُس نے دفتر کو تار لکھا کہ وہ بہت جلد آ رہا ہے، اور سوٹ کپس کھول کر نقدی کا حساب لگانے لگا۔ وہاں صرف اتنی رقم موجود تھی کہ وہ

قیصر نے دسے میں پھوکر اپنے شہر پہنچ سکے۔ جب وہ رخصت ہونے لگا تو اس کے میزبان نے بڑے اخلاص کے ساتھ کہا۔

میری آرزو تھی کہ آپ ہمیشہ میرے مہمان رہیں، مگر بھائی اواسس ہوں گی، مجھے فکر ہے کہ ملک کا اتنا بڑا مصنف چند دن کفریب خانے پر ٹھہرا۔ اچھا خدا حافظ! ”

مائی بھاتاں

اُس دی سارا شہر شیخ خیر الدین مرحوم کا پہلا جنم دن منار ہوا تھا!

یہ وہی منانے کے لئے مکی ہفتوں سے بڑی شد و مد کے ساتھ تیاریاں ہو رہی تھیں چنانچہ اخبارات کے عام نمبر شائع ہو رہے تھے۔ رسائل و جرائد میں مرحوم کی تصاویر چھاپی جا رہی تھیں اور آثار کی شام کو کارپوریشن کے میٹر کی زبردست ٹاؤن ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ عام بھی ہو رہا تھا اس جلسے میں شہر کی کئی مسماؤں و مشہور ہستیاں مرحوم و محفود کی زندگی کے واقعات پر روشنی ڈال رہی تھیں اور مجھے بھی اسی سلسلے میں مدعو کیا گیا تھا۔ مجھے مرحوم سے ذاتی واقفیت تھی۔ اس کے علاوہ اخبار و رسائلوں میں چھپے ہوئے مضامین کے مطالعے کے بعد میرے پاس اتنا مواد جمع ہو گیا تھا کہ ان کے بارے میں ایک تقریر کیا کم سے کم دس لمبی چوڑی تقریریں بھی تیار کر سکتا تھا مگر میں چاہتا تھا کہ جو کچھ انھوں نے مرحوم کی زندگی کے صرف ایک ہی پہلو سے متعلق ہو اور اس لئے میں نے جو موضوع منتخب کیا تھا وہ تھا شیخ خیر الدین آجہائی کے احسانات عام لوگوں پر۔ مواد انھوں کے سامنے بکھرا ہوا تھا اور میرا قلم بڑی تیزی سے اسے سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اُس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ صاحب مرحوم شہر کے مشہور رئیسوں میں تھے۔

آبائی وراثت میں آپ کو کافی جائیداد ملی تھی۔ اس کے علاوہ اپنی ذاتی کوششوں سے بھی آپ نے دولت میں کافی اضافہ کر لیا تھا مگر دیکھنے والی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ مرحوم نے اپنی دولت کو کہاں کہاں خرچ کیا اور مرحوم کے نزدیک اپنے سرمائے کا حقیقی مصرت کیا تھا۔ شیخ صاحب بے نزاعی کا آسرا اور یتیموں کا لہجہ تھے۔ ساری عمر خلق خدا کی خدمت کرتے رہے۔ آپ نے اپنی آمدنی کا ایک خاص حصہ لوگوں کی بہتری کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ استاد ذوق کا ایک شعر ہے یہ

نام منظور ہے توفیق کے اسباب بنا

پل جانا چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

اور مرحوم اس شعر کی ذمہ داری تھی آج خیر الدین ہسپتال کا نام کون نہیں جانتا؟ اس ہسپتال میں بدنامہ عیسویوں مریمٹوں کا علاج ہوتا ہے اور اکثر مریمٹوں کو دوا مفت دی جاتی ہے۔ مرحوم نے صرف ہسپتال ہی نہیں اپنی حبیب خاص سے ایک معقول رقم صرف کر کے ایک یتیم خانہ بھی تعمیر کروا دیا تھا۔ اب آج بھی اس یتیم خانے میں قوم کے کئی بے نوا اور بے آسرا بچے پرورش پا رہے ہیں۔ بے یار و مددگار لوگوں کو سارا دنیا مرحوم جی کا کام تھا۔

باؤ جی! ایک خط لکھ دو گے؟

میرا قلم چلتے چلتے ٹپ جاتا ہے۔ برا شاکر سامنے دیکھتا ہوں۔ مہراں گوالی اپنے صلیے ہاتھوں میں قالی لٹا کر پکڑے دہلیز پر کھڑی ہے۔

نکھ لکھ دو نا۔ ٹھہرت نہیں ہے؟

جانتا ہوں کہ اگر اس وقت تمام خیالات کو سمیٹ نہ لیا تو بعد میں عبارت کا رابطہ و تسلسل

نوٹ: بابائے گماور لکھنے میں وہ آسانی باقی نہیں رہے گی جو اس وقت حاصل ہے
گھر کیا کیا جائے انکار کرنے کو بھی سی نہیں چاہتا۔ مہراں گزشتہ دس سال سے بخیر پانی
ملنے دو دھہہ ہیا کر رہی ہے اور اس کا بہت بڑا احسان ہے، انکار احسان مرد خدا کے
خلاف ہو گا۔ چنانچہ میں سر کے اشارے سے اُسے اور آنے کے لئے کہتا ہوں۔ مہراں
اندھا تھی ہے اور فرش پر پھسکڑا مار کر بٹختے جاتی ہے

”باؤ جی تکلیف تو ہوگی۔ میری ہنس کو لکھتا ہے جو چنڈی میں رہتی ہے تحصیل۔“
تجھی پھلے باؤ لکھتا کیا۔ ہے۔ پتہ بعد میں لکھا جاتا ہے۔ ذرا ٹھہرو۔ کا غنڈے لون۔ ان،
اب بدلو۔۔۔۔۔“

نہیں یہ لکھتا ہے کہ جرات کی شام کو مائی پھا تکر ہو گئی ہے۔
یہ کہتے ہوئے اس کھجور بچیدہ ہو جاتا ہے۔

”خاطر کر مائی پھانیاں کا اس کا بڑا خیال رہتا تھا۔ جب خاطر کواری تھی تو ایک دفعہ
اس کا پاؤں خدا جل گیا تھا۔ پھانیاں سا مارا دن گھومتی اور اللہ چاہنے کہاں سے مرہم لے کر
آئی اس دن اللہ ماری پھر مال تھی ملے غم نہیں۔“

”مائی پھانیاں یہی تھی نا۔۔۔۔۔ دھوبن با میں ہو جاتا ہوں۔“

”ٹھکی کے زمر میں تو رہتی تھی۔ آپ کے کپڑے دھرتی ہوگی سا رے محلے کے کپڑے
دھرتی تھی وہ تو۔“

”یہی بات ہے برسوں اس کے گھر کے سامنے جنداؤ می بیٹھے تھے۔ تو مائی پھانیاں
مر گئی ہے۔“

”کیا کون کتنی بہت والی تھی۔ کام کر کے ٹھکتی ہی نہیں تھی۔ تو بہت

تھی کہ لوہے کی مشینیں مہراں تعریفِ لہجہ میں کہتی ہے۔

اور اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ بڑی لڑاکا تھی ہر وقت لڑتی رہتی تھی محلے کے لوگ اس سے بچاؤ مانگتے تھے۔ میں بچپن کی وہ خصوصیت بیان کرتا ہوں جس کا شہرہ عام ہے اور جس کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے۔

اُردو قزوین و رشتہ کی نور شہر میں بہت چھاتی تھی پر اپنے ختم سے رشتہ تھی لوگوں
نے اسے اللہ ہائے کیوں بدنام کر دیا تھا۔ میں بتاؤں تم کو کیسی عورت تھی وہ —
برسی ابھی۔ اسے آپ کا دست کراپ ہو رہا ہے؟

میں کاغذ پر غور کرتا ہوں۔۔۔ بے یار و مددگار لوگوں کو سہارا دینا
مرحوم ہی کا کام تھا۔۔۔ اگلا فقرہ سرچنے کے لئے میں بائیں ہاتھ کی تحبیل پر پیشانی رکھ
کر انگلیں بند کر کے سوچنے لگتا ہوں۔

دُنیا میں دستِ کم ایسے آدمی ہوں گے جنہوں نے ٹوٹے ہوئے دل جوڑے ہوں غلوں کو سہا مارا دیا ہوا اور جو بے کسوں کا آسرا بنے ہوں شیخ صاحب کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ گرسے ہوؤں کے بچے دوست تھے۔ میرے ذہن میں پورا فقرہ الفاظ کی مناسب ترتیب کے ساتھ آجاتا ہے۔ میں قلم و بعدِ نڈے کے لئے ادھر ادھر دیکھتا ہوں۔ مہراں مشر مشر مہری طرف۔ دیکھتی ہے نہ بنائے کیا سوچا ہی ہے۔ کیا کہنا چاہتی ہے اس کی خاموش نگاہیں ایک الجھائے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک ص آئندگی جھلکتی ہے۔ جی چاہتا ہے اس کی دو چار باتیں سنیوں، زیادہ سے زیادہ دو چار منٹ صرف ہوں گے اس کے بعد شیخ مرحوم کے دو چار واقعات لکھ کر تقریر کھنکھریوں گا۔ اور میں کہتا ہوں۔

نور، اور اکا نہیں تھی۔۔۔۔۔ تہاری مائی کیا تھی۔

خود رفتی۔۔۔۔۔ میں کہتی ہوں ہاں جی، اللہ بخشے میرے مراد کے میاں کو جب میں اس کے گھر میں آئی یہ دکر کے خود کہنے لگا دیکھو مراد! اس بھاتاں سے بڑے بڑے رہنما کسی دن لڑ پڑتی تم سے تو تمہارے سر کا ایک بال بھی نہیں بھڑکے گی۔ میں نے کہا میں بھی کسی سے وجہ والی نہیں ہوں مجھ سے لڑنے کی قومنہ کی کھائے گی۔۔۔ یہ بات تو میں نے کہہ دی پر بھاتاں سے ملنے ہوئے مجھے سچ بڑھتا تھا۔ اس نے کئی بار بھانا گھر میں دھندہ دور ہی رہی۔ ابھی میرے میں کو مرے ایک مینہ بھی نہیں ہوا ہر گز بھاتاں کی اپنے خضم مولہ بخش سے ایسی لڑائی ہوئی۔۔۔۔۔ ایسی لڑائی ہوئی کہ کیا کہیں بھاتاں نے تو سہرا آسمان اٹھایا اس دن میں سوج بیا کر میں اس سے کبھی نہ ملوں گی۔ پند ہے لڑائی نہ دھڑکی تھی وہ یہ تھی کہ بھاتاں نے کہیں سے من لیا تھا۔ موتی بخش کا کسی مراد سے یاد نہ ہو گیا ہے اور وہ اس کے گھر میں آتا جاتا رہتا ہے۔ بھاتاں کے من میں لگ ہی تو لگ گئی۔ من کو مراد میں کو وہ نہ قطعہ سنائیں کہ تو پہچانی۔۔۔۔۔ آدھی رات تک اس نے نکلے والوں کو سوتے نہ دیا۔۔۔۔۔ بے آپ کا وقت کھراب ہو گا ان کہاں بھاتاں کی کہانی لے بیٹھی۔۔۔۔۔ مہراں لڑنے ہوئے ایک تخت بے چین ہو جاتی ہے۔

”نہیں تم بھاتاں کی لڑائیوں کا حال نہ دے سناؤ۔“ میں خوشی کہتا ہوں۔

تیسرے دن بھڑائی ہوئی۔ مولہ بخش نے کہہ دیا کہ مراد میں کے گھر ضرور بایا کرے گا۔ میں بھاتاں تو بھوکے شہر تھی بھگتی۔ اس دن اس کا بچا بھی آگیا۔ اس نے فقہے میں آکر مولہ بخش کے ہاتھ کی پٹی توڑ دی۔ شاید وہ میرے قیامت کے دن کی بات ہے کہ میں کسی گاہک کو دودھ دے رہی تھی اتنے میں کہتی ہوں کہ بھاتاں مجھ کو ساکھ اس بھاتاں لے میرے پاس کھڑی ہے۔

بھوتنور! سادور جو دے دو۔ پھانٹاں نے کہا۔

میں نے اُسے دودھ دے دیا خیال تھا دودھ لے کر پہلی ہائے گی پردہ تو دھونا مار کر وہیں چلے گئی اور لگی باتیں سننے پہلے تو وہ کہنے لگی مولانا بخش کو بڑی تکلیف ہے۔ بے چارا ساری رات تڑپتا رہا ہے اور میں دور انزل سے بالکل نہیں سوتی۔ پھر وہ اپنے گھر کے کھانا بتانے لگی۔۔۔۔۔ اس دن مجھے ہنسنے لگا کہ پھانٹاں دل کی بُری نہیں۔۔۔۔۔ باز بھی وہ کیسے بُری ہو سکتی تھی اس کا خضم ایک میرا شن سے یا راز کر رہا تھا پھر بھی جب وہ تھی ہر ہر تپ ہے تو وہ ساری ساری ات جاگ کر اس کی خدمت کرتی ہے اور اپنی ٹولی ساس کی تو وہ اس دل سے خدمت کر رہی ہے جس دل اس کا بیاہ ہوا تھا۔ میرا شک ہوتا رہا اور وہ اس کے گھر آئے جانے لگی!۔۔۔۔۔ ہماری میں مولانا بخش نے کہہ دیا تھا کہ اب وہ میرا شن کے گھر بھی نہیں جائے گا کر جیسے ہی ٹھیک ہوا پھانٹاں کی سونے کی چوڑیاں چھانکر فرار دھر بھاگا اور میرا شن کو وہ چوڑیاں جسے آیا۔

پھانٹاں کے رشتہ داروں نے کہا وہ مولانا بخش کو چھوڑ دے پردہ اس بات پر رہا جی نہ ہوئی۔ میکے چلی گئی وہ ایک بیٹے کے بعد پھر آگئی۔ اللہ جانے اسے کہیں اپنے ایسے بھوسے خضم کا خیال رہتا تھا۔ میں ہوتی اس کی جگہ تو پتہ ہے کیا کرتی کہیں اور نہ جانتی کچھ کہتی ہوں، اچھا تو ایک دن کا ذکر ہے میں کوٹھڑی میں بیٹھی روٹی کھا رہی تھی کہ ایک عورت آئی۔ کوٹھے کی طرح کا دارنگ، فندہ جاری انار کی طرح سُرخ آنکھیں اور گھٹے میں موتیر کی مالا میں۔ نے کہا یا اللہ! کون ہے اور کہیں یہاں آئی ہے وہ عورت، کوٹھے میں کھاتی ہوئی آئی اور میرے پاس سر نہ دے پر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا: بہن تو کہہ دے آئی ہے اور کیا کام ہے اس پردہ پر۔ میرا نام دالین

بچے مصری شاہ میں رہتی ہوں۔ ذرا مرنے بخش کو بلا دو۔

میں بولی: ہائے تو تو یہی مراثی ہے نا۔۔۔۔۔ غدا بابا! میں تو اس کام میں نہیں آؤں گی۔
پھانسی نے کُئی لیا کہ تو یہاں ہے تو اُٹھ جانے کیا کرے۔ بڑی سخت عورت ہے سارا صدمہ
اس سے ڈرتا ہے؟

یہ کُئی کہہ بولی: ہاں! اب میں کہاں جاؤں، گھر والوں نے مجھے نکال دیا ہے کہتے ہیں
تو ڈانڈاڑ ہو گئی ہے۔ بولا بخش کہ غدا بلاؤ نا اس سے پوچھوں اب داگدار کر کے مجھے کس کے
حوالے کر تسہے بدداش کہیں گا۔

میں نے کہا: یہ تو میں نہیں جانتی کہ اب تم کہاں جاؤ میری اس کام میں نہیں آؤں گی کبھی
تو نے پھانسی کو دیکھا نہیں۔ اس نے اگر تجھے دیکھ لیا یہاں تو تیری ہڈیاں تپک پھیں ڈالے
گی! اُن اللہ جانے بڑی سخت عورت ہے پپ چاپ یہاں سے چلی جا۔ اسی میں تیری کبیر ہے۔
وہ بولی: میں تو جو دھاس سے ملوں گی۔ کُئی دن سے دہان نہیں گیا اللہ اُسے کسی کی آئے
کیوں آیا تھا میرے گھر دیکھا ہیں! تو مرنے بخش کو نہیں بلاتی تو میں خود اس کے گھر چلی جاتی رہتی۔

باؤنجی! وہ تو پھانسی کے گھر جانے کے لئے تیار تھی پر جب میں نے خوب ڈنایا تو کہنے لگا:
اچھا بھنڈی چلی جاتی ہوں دہان میرا موم رہتا ہے اور وہ باہر چلی گئی۔ اگلی میں اندھیرا
تھا میں اسے جانتے ہی نہ دیکھ سکے۔ کچھ لایا اب تو اتنا ڈنڈا لگی ہے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھ سکے
مجھ سے میرے میں پھانسی کے گھر گئی تو کچھ میں نے دیکھا وہ بڑا ہی زالا تھا، پھانسی کپڑا
پر استری کر دی تھی اور وہ۔۔۔۔۔ بھلا کون۔۔۔۔۔ وہ مراثی پھانسی کی سوکھ۔۔۔۔۔ مری

پریشی دہی کے ساتھ رات کی بھی چلی روٹی کھا رہی تھی۔ میں سریاں وہ گئی۔ پھانسی کہنے لگی: مرنے
مہانتی ہو کر رہے؟

بانجی چھوٹے بھائیوں کے بچے ہوئے۔ بڑی شرمیلی تھی میں تو اسے دیکھ کر ہی بکھڑا
 گئی تھی کہ بچے کی نہیں پر جسے اللہ رکھے اُسے کون کچلے۔ بچی سنبھل گئی اور اس کی حالت کرباب
 ہو گئی بھانوں نے اس پر کافی رقم صرف کر دی لیڈی ڈاکٹر کو کچا یا۔ مگر وہ بچہ نہ سکی۔ اس
 وقت عیشاں — — — دواؤں کا میسینہ کی تھی!

ماں سرگئی تو بچی کون پا رہی تھی۔ داروں نے مرتے وقت بچی بھانوں کے حوالے
 کی تھی۔ بس بھانوں نے اسے چھاتی سے لٹالیا اور اپنی بچی جان کر بانے لگی، اللہ جانے پتا
 کو بچی سے کیوں اتنا پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اسے گدے سے اتارنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی!
 مہراں کو پھر اس بات کا احساس ہونے لگا ہے کہ اس نے میرا کافی وقت ضائع کر دیا ہے۔
 چنانچہ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس خالی لٹاؤ کو دیکھنے لگتی ہے جیسے وہ ساتھ لائی تھی اور
 جواب چار پائی پر میرے کاغذوں کے انبار کے اوپر پڑا تھا۔
 یہ بچی زندہ رہی — — —! یہی سوال کرتا ہوں۔

مہراں کے گھٹنے پھر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور وہ جلدی سے کہتی ہے
 سچی ہاں! زندہ رہی پر بھانوں کے لئے تو ایک مصیبت بن گئی تم بڑھو گے کس طرح
 — — — وہ اس طرح کہ جب تک سواش زندہ رہی لوگ بھانوں سے کہتے رہے۔ یہ بچی اللہ جانے تو کون
 عورت ہے اسے ذرا گھر سے نکال دو اور جب وہ مر گئی تو وہ بولے۔ یہ بچی اللہ جانے تو کون
 کی ہے بھی یا نہیں اسے اس کی مانی کے گھر بگوا دو۔ سنا باؤ بی! مطلب یہ کہ بچی کے بارے
 میں ای کو شک تھا تو ایک دن بھانوں کے گھر برادری کے سب لوگ آئے اور
 کہنے لگے۔ دیکھو بھانوں ہم اب تک تمہارا منہ دیکھتے رہے ہیں اب کھیرا سی میں ہے کہ
 اس کا اس کی مانی کے گھر بیچ دو اور نہ ہم سے بڑا کوئی نہ ہو گا — — — اس وقت بھانوں

نے پتہ ہے کیا کیا وہ مینہ آج کر دلی۔ میں اس مصوم کو کبھی نہیں چھوڑوں گی۔
 اگر تم نہیں چھوڑو گی تو ہم تمہارا بیانی سکاٹ کر دیں گے انہوں نے کہا۔
 جہول میں آئے کرو۔ میں تو اسے چھاتی سے لگا چکی ہوں اب موت ہی اسے
 جسدِ کار سے گی۔

مہراں کے لبِ دل میں جوش پیدا ہو گیا ہے اوردہ اس طرح جہول رہی ہے جیسے سٹیج
 پر پھانساں کا کردار ادا کر رہی ہے۔

تو بڑا دبی نے پھانساں کا ہاسٹیاٹ کر رہا ہو گا۔

نہی اں ————— سولا بخش بھی پیری کے خلاف ہو گیا۔ پھانساں کے دونوں لڑکے پہلے
 ہی مراثی کے بہت خلاف تھے۔ وہ ماموں کے گھر چلے گئے وہیں کام کاج کرتے
 ————— میں نے جب دیکھا کہ پھانساں اپنی سند سے بڑا نساں ————— کر رہی ہے تو
 ایک دن اس سے بولی۔ پھانساں! اس بچی کو بھیج ہی دو کیا فائدہ اسے گھر میں رکھنے کا سب
 لوگ تمہارے بغلاف ہو گئے ہیں۔

یہ سُن کر وہ کہنے لگی

”نہیں ہوا ایسا نہیں ہو گا۔ میں نے اس کی ماں سے کہا تھا کہ اسے سینے سے لگا کر
 رکھوں گی کیوں بچوں اسے۔ لوگ بغلاف ہو گئے ہیں تو بے شک ہو جائیں۔ جب کسی کو ہمارا
 دیا ہے تو لوگوں سے کیوں ڈریں۔“

میں نے کہا۔ ”تمہارے اپنے لڑکے بھی تو بغلاف ہو گئے ہیں۔“

پھانساں کی انگلیاں آنسوؤں سے بھیگ ہی گئیں۔

لوگ کہتے ہیں لڑکاں باپ کا بازو بنا ہے پر میرے لڑکے تو اللہ کی ماریاں پر اچھا

جو چاہیں کہیں اس سے ڈر نہیں جاؤں گی۔ اللہ خدمت کے سب کام کر لیا کروں گی۔
 اور پھانیاں سب کام کرنے لگی۔ عیشاں بڑی ہونے لگی۔ پھانیاں نے رات
 دن محنت کر کے اس کا بھینر بنایا اپنی ساری پونجی اس پر صرف کر دی۔ جب عیشاں کا
 بیاہ ہوا تو پھانیاں بڑی خوش تھیں کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ باوجودی برا لڑکیاں کو یہ
 بات منگھونہ تھی۔ عیشاں کی شادی گجرات میں ہوئی تھی وہاں کسی نے عیشاں کے سر کو بتا
 دیا کہ عیشاں ایک مراٹھ کی بیٹی ہے۔ بس پھر کیا تھا سسرال والوں نے مار پیٹ کر پھانیاں
 کے گھر بھجوا دیا اور بعد میں کاغذ بھی بھیج دیا۔ اور عیشاں حلاق لے کر گھر آئی اور مولا بخش
 خون توڑ کینے لگے۔ پھانیاں پر دہرا صد میرا کوئی اور ہوتا تو پاگل ہو جاتا پر پھانیاں نے ہمت نہ
 ہاری لولی ماس کی بھی خدمت کرتی رہی۔ خنم کی بیماری پر بھی خرچ کیا اور لوگوں کے
 کپڑے بھی دھوتی رہی۔

تاجی پھانیاں کا رشتے میں بھائی کا بیٹا تھا۔ بڑا آوارہ گرد تھا۔ پھانیاں نے اسے گھر میں
 رکھ لیا۔ یہ لڑکا کام کاج میں مدد دینے لگا اور جب پھانیاں نے دیکھا کہ تاجی ٹھیک ہو گیا ہے
 تو اس کی شادی عیشاں سے کر دی خدا خدا کر کے پھانیاں کے سر سے یہ بوجھ بھی اُتر گیا۔
 اب سندر مولا بخش دو سال بیمار رہا پھر مر گیا! دو چار دن بعد پھانیاں کی لولی ماس بھی چل
 بسی۔ پھانیاں کی شادی کے بعد پورے تیس دن بیمار رہیں نہ نہ رہی تھی یہ پوچھتے تین دن بعد برسر
 اتنے سال پھانیاں نے اس کی خدمت کی تھی۔

ایک رات پھانیاں کپڑوں پر اسٹری کر رہی تھی کہ اسٹری سے اللہ جانے کس طرح کھٹے
 نکل کر اس کے کپڑوں پر آگے اور بھاری کے گھسنے لگی گھٹے اور سویر تک بے ہوش پڑی
 رہی۔ صبح عیشاں نے نیچے اُتر کر دیکھا تو اپنا سر پیٹ لیا ہم سب نے مل کر اسے چار پائہ پر

”رکھ دو یا ڈھکی“

میں کا غذ کا لٹا ہوں اور کھنے کے لئے تیار ہو جاتا ہوں مہراں آنکھیں بند کر کے نہایت
باتھ کی لٹکیوں سے انھیں دباتی ہے اس کی آنکھوں کے نیچے ابھری ہوئی ہڈی سن آنکھوں
باقی ہے مہراں انگوٹھے کی ساتھ والی انگلی سے اس نوک شک کرتی ہے اور ایک لمبی بھجور چھپا
”کھو یا خد“

”ہاں“

میں خد مکمل کر کے اس کے ساتھ ہیں۔ ”نئے جیتا ہوں۔ وہ آٹھ بیٹھتی ہے اور جانے لگتی
ہے۔“ وہ دوا سے کے قریب پہنچ کر ڈگ جاتی ہے۔

آج سہر میں چند ریاں کیوں لگائی تھیں؟ مہراں پوچھتی ہے۔

”نہیں معلوم نہیں۔ آج شیخ خیر الدین مرحوم کا یوم ولید منایا جا رہا ہے۔“

”اچھا! شیخ خیر الدین۔۔۔۔۔ میں نے انھیں دیکھا تھا بہت بڑے آدمی تھے۔“

پھانسی ان کے کپڑے بھی دھو یا کرتی تھی۔

مہراں پہلی جاتی ہے۔ میں تقریر مکمل کرنے کے لئے کاغذ پر جھکتا ہوں۔ مجھے کچھ بھی

نہیں سوجھ رہا۔۔۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے پھانسی کا بڑا چہرہ ابھرنے لگتا ہے

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس چہرے پر صدیوں کی بے لوث خدمت کا غبار پھایا ہوا ہے

اس غبار میں اس کی خاموش نظریں مجھ سے ایک سوال پوچھ رہی ہیں اور میرے ذہن میں

مہراں کے الفاظ گونج رہے ہیں۔۔۔۔۔ ”خیر دینی بہت بڑے آدمی تھے پھانسی

ان کے کپڑے بھی دھو یا کرتی تھی۔“

کبیل

آج بھی سردی اتنی ہی شدید ہے جتنی چار دن پیشتر تھی۔ میرے اوپر ہاروں طوفانِ رضا میں رنگا رنگ بادل کبھی بکھر جاتے ہیں اور کبھی اس طرح ایک دوسرے سے لپٹ جاتے جیسے کوئی مفلس آدمی سردی سے بچنے کے لئے اپنے جسم پر جینٹروں کو صلیٹ لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہوا میں تندہی اور تیزی ہے۔ شاید شام تک باد و باران کا طوفان بجائے۔ اور پھر گھر تک پہنچنا مشکل ہو جائے۔

میں شام سے پہلے پہلے واپس اپنے مکان پر پہنچ جانا چاہتا ہوں اور اس مقصد کے لئے جلدی جلدی قدم اٹھا رہا ہوں۔ سردی سے محفوظ رہنے کے لئے میں نے جینٹروں کو رکھا ہے۔ ادنیٰ ٹوپی سر سے بھی ڈھکا ہوا ہے اور میری ہنٹل میں ایک کبیل بھی ہے۔ لیکن یہ کبیل میرے اپنے لئے نہیں، چوکیدار غنی کے لئے ہے اور اس وقت میں اسی کے گھر کی طرف جا رہا ہوں۔

اب میں شہر کی اس سڑک پر پہنچ گیا ہوں جو آبادی کے ہنگامہ زاروں میں سے گزرتی ہوئی بانہ اور عالی شان عمارتوں کے پاؤں پھوٹی ہوئی دودھ کی جاکر نچلے طبقے کے بن گھروں کے پاس ختم ہو جاتی ہے۔ مجھے انہیں گھروں میں سے ایک گھر میں جانا ہے کیونکہ چوکیدار غنی وہیں رہتا ہے۔

ابھی ابھی میں نے ایک ہوٹل میں چائے کی دوگرہ پیالیاں پی ہیں۔ پھر بھی مٹری کے تصور سے بار بار جھنجھری سی آجاتی ہے۔ مجھے آج کل سردی سے ڈھبھی بہت لگتا ہے۔ اور اس ڈک کے پس منظر میں ایک بڑا تلخ تجربہ ہے اگر یہ تلخ تجربہ میری زندگی میں آتا تو میں سردی سے اس قدر کبھی نہ ڈرتا۔ کبھی یوں بار بار ہوٹل میں چائے نہ پیتا اور کبھی اس درجہ بھل میں قیمتی کسبل دابہ کران خراب دھستہ گھروں کی طرف چلنے کا ارادہ نہ کرتا جو اس شہت مشرک کے آخری سرے پر کھڑے ہیں اور جہاں ایک بہ نام مکانی میں چوکیدار غنی بھی رہتا ہے۔ واقعہ بالکل معمول تھا مگر اس کا نتیجہ نہایت اہم ثابت ہوا۔ اتنا اہم کہ میں اسے زندگی کے کسی لمحہ میں بھی فراموش نہیں کر سکتا۔

خان صاحب سر دراز خان رشتے میں میرے امروں جوتے ہیں۔ میں سات روز سے ان کے ہاں ٹھہرا ہوں۔ انہوں نے مجھے اپنے مکان کا چھٹا کمرہ دے رکھا ہے اور میں بڑی آزادیاں کے ساتھ اس کمرے میں صوفائی کے لطیف اشیاء یا بولدا کچ سے چادر دن پہنے۔ یعنی منسل کی شام کو میں اس موقع کے ساتھ گھر سے نکلا کہ وہ رات اپنے ایک دوست کے ہاں گزار کر صبح ہی صبح لوٹ آؤں گا۔ گھر والوں کو بھلا اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا وہ میری طرف سے بے فکر ہو کر اپنے کسی عزیز کے یہاں شادی میں شریک ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ میں ان کے بدلے سے بیشتر ہی دوست کے یہاں پہنچ گیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر کچر دیکھنے کا پڑنا بنا رہے تھے کہ سرفان کو اپنے والد کی شدید مخالفت کا تاثر ملا۔ ایسی حالت میں وہ کس طرح لوگ لے سکتا تھا چنانچہ اسی وقت راولپنڈی روانہ ہو گیا اور میں اپنے گھر کی طرف بل پڑا۔

اس وقت مجھے خیال تک بھی نہ آیا تھا کہ جیسے ہی اپنے کمرے کا دروازہ کھولوں گا ایک نیا مگر نہایت ناگوار تجربہ مجھ اپنی گرفت میں لے لے گا اور میں ایک ایسی کشکش

میں گرفتار ہواؤں کا جس کاہن سوئی تو درتک نہیں کیا تھا گھر پہنچے پہنچے طرانا کے
 آثار پیدا ہو چکے تھے اور سردی کافی بڑھ گئی تھی۔ ایسے عالم میں زم اور گرم بستر کا خیال
 دماغ میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔۔۔۔۔ ایک ایسی کیفیت جو ہائے کی
 ایک خوبصورت چہان کو سامنے رکھ کر اس کے نشہ آور قیور کو سو گھنٹے ہی سے محسوس
 کی جاسکتی ہے۔ یہ خیال گھنٹے میں سے بے نیاز کر دیتا ہے اور میں بھی اس وقت ماحول
 سے بے نیاز ہو چکا تھا۔۔۔۔۔ یہی جی ہوتا تھا کہ اگر گھر پہنچ جاؤں اور کپڑے اتارنے
 بغیر محاف میں گھس جاؤں۔۔۔۔۔ مکان کے سامنے بیٹھا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک آواز
 آئی۔ ہائی۔ آگئے ترم۔

یہ فنی جو کیدار صاحب کی غفلت سے تو نہیں البتہ گریج دار آواز سے میں ضرور آشنا
 تھا۔ یہ آوازیں کو کوئی کئی بار میرے کمرے کے سامنے خیردار ہو جاتی۔ کہتی ہوئی
 گزرتی تھیں۔ اور میں ہر بار پریشان ہو جاتا تھا۔ اسی ناپسندیدگی کا اثر تھا کہ میں نے اس
 کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ مڑ کر دیکھنے کی ہی کوشش نہ کی خاموشی سے قفل کھولا
 اور اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ جیسے ہی درجہ روشن ہوا اور میری نظر چنگ پر پڑی
 تو آنکھوں کے سامنے سارے سے ناچنے لگے۔ چنگ کے اوپر ایک چادر لٹکی ہوئی
 کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ عیاں یاد آگیا کہ اس صبح کو خاں صاحب کی حازمہ دھوپ
 دینے کے لئے میرا محاف دینرو اوپر لے گئی تھی اور شادی کی تیاری میں کسی کو ان چیزوں
 کو پیچھے رکھنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اس وقت میری صحت بڑی عجیب تھی۔ سوچا تھا کہ
 باہر چلا جاؤں۔۔۔۔۔ مگر کس کے گھر۔۔۔۔۔ رات کے دس بج چکے ہیں کون انداز
 کھانے کا اور پھر اس خیر میں میرے دوست ہیں۔ اور اگر کمرے ہی میں رہا تو کون

سے بچنے کی کیا صورت ہوگی؟

باد و باران کا طوفانی خروش مسلسل میرے کانوں سے ٹکرا رہا تھا اور مجھے بار بار جبر پھر آ رہی تھی۔ لحاف اوپر سے انہیں لٹکا تھا کیونکہ وہ لوگ سب کمرے میں مقفل کر کے گئے تھے۔

سردی بڑھتی جا رہی تھی اور ہونک لہریں سوئوں کی طرح جسم کو جھٹکنے لگی تھیں۔ کھڑکی کے پٹ بڑی طرح آپس میں ٹکرا رہے تھے اور مجھے یوں محسوس ہوا جتنا جیسے کسی ٹوٹنے والا کھڑکی کے پٹ پر پڑ پڑ کر بچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اُس نے کہا کہ اس کا واسطہ بھونک گیا ہوں۔ اور اب چاروں طرف گرا اندھیرا چھایا ہوا ہے کہ ناکہ کو کوئی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی۔ تو کیا ساری رات اسی طرح کا نہتے کا نچے گزارنا ہوگی۔۔۔۔۔ چینی، چٹائی و محل ہوا اسی طرح صبح تک میرے بدن کو چھیدتی رہے گی۔ سردی سے محفوظ رہنے کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔ فرار کی کوئی صورت نہیں۔۔۔۔۔ جیسے گی؟ سوال میرے دماغ میں اس طرح برپا ہو گئے تھے جیسے آندھی کے قہر میں کسی منہدم عمارت کی کمرود دیواروں پر ٹھٹھانے کے ساتھ ٹکرا رہے ہوں۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ایک سردی میں دنیا کی سب سے بڑی نعمت ایک گرم رضائی یا کپڑا ہے جس کی حرارت اکثر ہی حرارت ایک نیم جلا لٹکتے ہوئے جسم کو اپنی گود میں لے کر نیند کی راحتوں سے سرشار کر دیتی ہے۔

اگر میرے دوست کو تار نہ ملتا تو، گھر سے چلا نہ جاتا اور اگر اسے تلہ ملا بھی تھا تو میں امرتار کے اس کے کمرے سے باہر نہ نکل آتا اور اگر یہ بھی ہو گیا تھا تو میرے میزبان شادی میں شریک نہ ہوتے۔ یہ دونوں باتیں ہو جاتیں پھر بھی کوئی تعظیف نہ ہوتی جتنی کہ تلہ نہ گھر سے جاتے وقت بہتر نیچے تلہ نہ بھول جاتی یا کوئی اور ہی شخص اسے یہ کام

کرنے کو کہہ دیتا۔ ہاں گھر میں کسی کو بھی یہ بات نہ سوجھی۔ کوئی بھی ادھر تو جو نہ کر سکا۔
دو دن میں اس وقت پلنگ کے پاس یوں حیرانی و سرابہ کھڑا رہتا۔ لحاف میں گھس کر سو
چکا ہوتا اور اس بات کا خیال تک بھی نہ کرتا کہ باہر سو سلا دھار بادش ہمدہی ہے۔۔۔
یا سردی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔

بارش کیے ساتھ شاید اسے بھی گونے لگے تھے۔ مگر جتنی ہوتی ہو ایسی تیزی اور تندہی
بڑھ چکی تھی اور میں سردی کی تاب نہ لاکر کئی طرح کانپ رہا تھا۔۔۔ بیک بیک کھڑکی
کے باہر اندھیرے میں روشنی کا ایک ذرہ سا تھر تھرنے لگا اور پھر راز آئی۔
"باؤنجی! آج گھر میں کوئی نہیں۔ تم بیاہ میں نہیں لگے مہ؟"
میں نے فوراً سے ادھر دیکھا یہ چوکیدار غنی کی آواز تھی۔ وہ بیڑی بی رہا تھا اور کھڑکی
کے سامنے لگ کر کھڑا تھا۔

"تم گھر کی چوکیداری کر دے گے باؤنجی۔" اس نے چند لمحے ٹھہر کر کہا۔
"ہاں!"

"اچھا! اور وہ ہنسنے لگا۔ سو جاؤ باؤنجی! آج تو بڑی سخت سردی ہے۔"
وہ ابھی تک کھڑا تھا۔ میں نے کہا: "یہ لوگ چلے گئے ہیں اور میرا بستر اوپر
چھوڑ گئے ہیں!"

میں کسی ہمدردانہ جواب کا منتظر تھا مگر وہ بے اختیار ہنسنے لگا۔ "آج تو بڑی
پھنسنے ہیں نا!"

میری رگ، رگ میں کانٹے بچھنے لگے۔ میں غصے سے کہنے لگا: "وہ لاچار آدمی ہو جائے
کہ اس کا چہرہ بھی ہٹ گیا اور میرے غم و غصہ کا شدید عذابان شراردن کی طرح جڑی

میں بھر کر رہ گیا۔ میں نے اُنکے کمرہ کی بند کن دی اور دروازے پر جھکڑا ہوا اسے
 بلانا چاہا مگر حلق سے آواز نکل ہی نہ سکی۔ یہ خود داری کا جذبہ تھا جو اُسے بلانے سے
 روک رہا تھا۔ سردی کا ڈر اور خود داری کا تقاضا — اسی کشمکش میں
 دورانِ بند کرنا بھی بھول گیا۔ پیچھے ہٹا اور اپنے اگلے درپے درپے کھینک پڑا کڑوں میں بٹھ گیا۔
 چند لمحوں کے بعد غینہ کے غبار کی ہلکی سی تیسیرے دل و دماغ پر چھا جاتی اور میں نزدیک
 کے عالم میں سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے یوں محسوس کرنے لگا جیسے برف کے ایک برکے
 سے تودے کے اوپر بیٹھا ہوں اور یہ تودا پانی کی ایک وسیع سطح پر بہتا ہوا کسی نامعلوم
 منزل کی طرف بڑی تیزی سے چلا جا رہا ہے۔ ساحل کی جھلک دور دور تک بھی کہیں نظر
 نہیں آتی۔ ہاں نیلگوں پانی کی بیکراں دنیا کے آؤزی گوشے میں سرمئی بادلوں کے پیچھے سیاہ
 نقطوں کا ایک جھوم سا نظر آ رہا ہے۔ شاید یہی ساحل ہے۔ یہاں آگ ہوگی، حرارت ہوگی،
 زندہ رہنے کا سامان ہوگا۔ — اچانک وحشی لہروں کے خوں ناک تھپڑے اپنی
 پوری طاقت سے مجھے ایک طرف دھکیلنے لگتے ہیں اور میں تودے سے گر کر نیچے
 ہی نیچے پانی کی تادیک گہرائیوں میں جانے لگتا ہوں۔
 اور میری آنکھ نکل گئی۔

اپنے آپ کو بُری طرح کاٹھنے دیکھ کر میرے اندر خوف و دہشت کی ایک لہری دھڑ
 گئی۔ اندھیری رات ساری کائنات کو اپنے طوفانی آغوش میں جکڑے ایک ڈراؤنے
 ہولناک غار میں اتار رہی تھی جہاں چاروں طرف برف کی سلیں بکھری پڑی تھیں
 — جہاں موت کے سرد ہاتھ اپنے لمس سے لوگوں میں تیزی بخند کر رہے تھے اور
 جہاں دم گھٹا جا رہا تھا۔

بادل گرج رہا تھا۔ اور میں سردی کی شدت سے ہر عضو میں ایک سخت اذیت محسوس کر رہا تھا۔

میں نے دیوار سے ٹیک لگا دی۔ ٹکیہ اپنے زانو پر رکھ لیا اور غور و فکر کے لئے کوئی موضوع سوچنے لگا تاکہ اس طرح داغ مشغول رہے اور رات کسی نہ کسی طرح کٹ جائے۔

سوچنے سے کسوفی کسی حاصل ہوئی۔ اور نیم غنودگی کی سی کیفیت میرے شعور میں رینگنے لگی۔ انہی لمحوں میں مجھے یاد آیا کہ میرے کمرے سے طعن ایک پھوٹا سا گرم ہوا بھی ہے جہاں خاں صاحب کے گھر والوں نے ناقابل استعمال پرانی چیزیں پھینک رکھی ہیں۔ ممکن ہے یہاں کوئی چھٹا پڑا ناکیل یا لحات بھی پڑا ہو اور میرے دل میں ایک اُمید سی جاگ اٹھی رہے مگر نہیں کب اٹھا۔ کب اس ملحقہ کمرے کی طرف روانہ ہوا اور کب اس کا دروازہ کھولا۔ یوں محسوس ہوا جیسے ناکھوں میں چلنے کی سکت ہی باقی نہیں رہی جیسے سر سے ہاتھ تک جھوٹیاں ہی لٹ رہی ہیں۔ آنکھوں تلے پتھر کی ایک بڑی سی بیل بڑی تیزی سے گھوم رہی ہے پھر میرے بدن سے ٹکراتی ہے۔ اور پھر ہر طرف اندھیرا پھیل جاتا ہے۔ اور پھر مجھے محسوس ہوا کہ ملحقہ کمرے سے کوئی گرم سی چیز اٹھا لایا ہوں۔ یہ چیز میں نے اپنے جسم پر پھیلا دی ہے۔ زندگی کی حرارت میسرے لڑتے مجھے جسم میں عود کرا آئی ہے اند میرے اند ایک عجیب پُر اذیت غنودگی کا احساس جاگ اٹھا ہے۔ پھیل رہا ہے۔ پھیلتا چلا جا رہا ہے۔

سکوت ————— حرارت ————— کسی اجنبی سائل پر لادگی آگ ————— میٹھے لطفے ————— چڑیوں کے چھپے ————— اند پھر ایسی آوازیں جیسے دود کہیں پڑیا ہیں

ٹھکرا رہی ہیں۔

میری آنکھ کھل گئی برسات میں صاحب سکا کر میری طرف دیکھ رہے تھے اور میرے جسم پر میرا ہی لحاف پڑا ہوا تھا۔

”بھئی رات کمال کر دیا تم نے۔ واپس کیوں آگئے تھے بدست کے گھر سے بڑی تکلیف ہوئی ہے بستر کے بغیر“

میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

”اند بھائی یہ سیلا کچھلا کبیل کہاں سے اٹھا لائے تھے؟ ہاں صاحب نے سوال کیا۔
”کوئی سا کبیل؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی بھائی جو تم نے اور ڈھونڈ رکھا تھا۔ ہم نے صبح اگر اسے پہرے پہنک کر تھارا
لحاف تمہارے اوپر ڈال دیا ہے۔“

خان صاحب کی نگاہیں ٹھکرا رہی تھیں۔ یہ یقیناً کچھ چکے ہیں کہ میں رات سردی
سے بچنے کے لئے اس کے پٹائی چیزوں والے کمرے سے کبیل نکال لایا تھا۔

بات یہیں پر ختم ہو گئی اور میں دھڑکے چپے لگا۔

اس رات کے بعد جرات آئی وہ بھی سرد تھی۔ مگر میں اپنے گرم اند پھولدار لحاف
میں لٹک اٹھا رہا تھا۔ اس رات کسی وقت بھی چوکیدار غنی کی آواز نہ گونجی۔ اس کے بعد
بھی اس کی آواز نہ سنائی دی۔ اور آج صبح مجھے معلوم ہوا کہ چوکیدار غنی کو فونوہ ہو گیا
ہے اور وہ ڈیوٹی پر نہیں آ رہا۔

آج سے چار دن پہلے اس طوفانی رات کو مجھے جو تلخ تجربہ ہوا تھا، وہ میں کبھی نہیں
بھول سکتا۔ میں جان گیا ہوں کہ سردی کی شدت کیا ہوتی ہے اور جب سردی اپنا پورا

دار کرتی ہے تو انسان کی کیا کیفیت ہو جاتی ہے۔

میں نے چوکیدار غنی کے لئے ایک تھیں کھیل خرید لیا ہے اور اسے بغل میں ڈال کر اس کے گھر کی طرف چلا جا رہا ہوں، میرا دل بہت خوش ہے۔ میں اپنے سامنے چوکیدار غنی کو دیکھ رہا ہوں جو کھیل کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ اور اس کی منہ اندازہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔

اب بڑا کھم ہو گئی ہے۔ وہ سامنے شکستہ مکان کھڑے ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ چوکیدار غنی کا مکان پہلے رنگ کا ہے۔ اور وہ ————— اس طرف ایک چھوٹا سا مکان دکھائی دے رہا ہے۔ یہ میری منزل مقصود ہے۔ اسی جگہ میں ایک بجا شخص مجھے لئے ایک بہت بڑی نعمت لیکر جا رہا ہوں۔ ایک عورت مجھے ایک تگڑا تاریک ٹھکانہ میں لجاتی ہے جو کھیل غنی ایک چارپائی پر لٹا کھانا رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ لگنے کی کوشش کرتا ہے اور کھانسی بھرنے کے لئے چھاتی پلاتا کھاتا ہے۔

کیوں باؤ جی؟

”بھئی غنی تمہارے لئے یہ کھیل لایا ہوں۔ تمہارے نہیں بخار ہو گیا ہے؟“

”ناں باؤ جی۔ یہ نہیں۔ مجھے میرا ہی کھیل دو؟“

”تمہارا کھیل؟ ————— کونسا؟ میں حیران ہو کر رہ جاتا ہوں۔“

”باؤ جی۔ میں ابھرے گندارت دیکھا تم فرش پر گر پڑے تھے اور کانپ رہے تھے۔ میں نہیں اٹھا کر

چنگ پر نہ دیا اور اپنا کھیل اور بھاریا مجھے بڑی لگ گئی۔ پر کیا ہے ارمان آجائے گا؟“

وہ زور سے کھانسی لگتا ہے میں ٹھٹھکی باندھ کر اسے دیکھ رہا ہوں۔ ————— اور میرا

تمہیں کھیل ایک ایسا برہم بن گیا ہے جس کے نیچے دب کر رہ گیا ہوں؟

دینو

اب دوپہر ٹھہر چکی تھی اور سورج کی شعاعوں میں مجلس دینے والی کیفیت تھوڑے کم ہو گئی تھی مگر سوچی سمجھ دین کی واحد مدفق دینو گریسے کی شکل دور دور تکس بھی کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ عالم مودہر مہم گرام میں جب آفتاب نصف النہار پر پہنچ جائے تو لاکھوں کی بھیروں اند کوڑوں میں سماجی زندگی کی بعض کافی مسست پڑ جاتی ہے اور یہاں کھلنے کے ارتکوں کے شور وغل کے سوا اند کوئی ہٹا سر باقی نہیں رہتا۔ ایسے عالم میں چوک بھڑام کی چل پھل بھی ختم ہو جاتی تھی لیکن چوک کے اس تختے میں جہاں اس کی وسعت چند چھوٹے بڑے مکوں کی قطاروں میں سمٹ کر ایک جگہ کی سہی شکل اختیار کر لیتی ہے وہاں مساب آتش بازی کے گھوڑے عین سامنے صدر دین کی دکان پر اس وقت بھی مدفق ہیں کوئی گمی نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ اس مدفق کا واحد سرچشمہ دینو گریا دکان کے اندر موجود رہتا تھا اور اس کی درد انگیز اند پر سنے آواز دیر تک ٹھننے والوں کے دلوں کو مسافر کرتی رہتی تھی۔ گھما س دن صدر دین کی دکان بھی اس مدفق سے خالی تھی۔ کیونکہ دینو ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا اور اس کے سامنے ساتھی دکان کے اندر دھڑکے ہوئے بڑی بے قراری سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

دینو صرف آنکھوں ہی سے مفق نہیں تھا بایں ہاتھ سے بھی محروم تھا اس کا

بایاں بازو بالکل ٹھیک تھا۔ ہاتھ بھی درست حالت میں تھی۔ مگر ہاتھ کے آخر میں جہاں ہاتھ ہونا چاہیے اس جگہ گوشت ہڈی کے اوپر پھیل کر ایک لوتھر کا سا بن گیا تھا۔

دینا اپنی عادت کی وجہ سے یاد رکھنے والوں کی نگاہوں سے اہل عیب چھپانے کے لئے دکان کے وقت اسے ایک میلے رومال سے چھپاٹے رکھتا تھا اور جن لوگوں کو اصل حقیقت معلوم نہیں تھی وہ یہی سمجھتے تھے کہ دینے نے ہاتھ کے زخم پر بیٹی باندھ رکھی ہے اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ مگر جس وقت وہ صدر دیں کی دکان کے اندر بیٹھ کر بائیں ٹانگی ہاتھ گھڑے کے منہ پر ڈال کر اور دوسرے ہاتھ سے گھڑا بجا بجا کر سیف اندر لے کر سیف زلیخا کے شعر گاتا تو سمجھنے والے ایک بار تو ضرور ہی جھوم جھوم اٹھتے تھے۔ اسے سیف الملوک کے سارے کے سارے شعر زبانی یاد تھے اور یوسف زلیخا کے بھی بے شمار اشعار حافظے میں محفوظ تھے۔ وہ عموماً وہی شعر شوق سے سناتا تھا جن میں دردِ بجزا، دکھ اور غم کے جذبات بیان کئے گئے ہیں۔ وہ کسی کی فرمائش پر نہیں گاتا تھا اور کبھی کسی نے گانے کی فرمائش اس سے کی بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے شوق سے گاتا تھا اور گھنٹوں گاتا رہتا تھا شاید آنکھیں اور ہاتھ سے معذور ہر شخص کی وجہ سے اس کے اندر محرومی کا بحر شدید احساس پیدا ہو گیا تھا وہ اسی شکل میں دیر کر رہ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہفت روزہ ہر موسم اور ہر حالت میں اپنے گھر سے چل کر صدر دیں کی دکان پر ضرور پہنچ جاتا تھا اور جب تک شام کا اندھیرا پھیل نہیں جاتا تھا دکان سے باہر قدم نہیں رکھتا تھا۔

ہر روز نکالنے کے سانسے پہنچ کر جیسے ہی وہ اپنی لاشی دکان سے زمین پر مار کر

بلند آواز میں اسدیل یکم کہتا ہوں طرٹ ایک کھلی سی مچ جاتی — مایا رام اپنی گھر کی
 میں سے اُٹھ کر جلدی سے نیچے اُتر آتا — مہتاب آتش باز اپنا کام چھوڑ کر اپنے
 سامان دہلی کو ٹھٹھی کر تالا لکانے لگتا — اور حسودہ جونی بھی اس کے آنے کی
 خبر سُن کر گرم استری اپنی بڑ بڑاتی ہوئی بیوی کے حوالے کر کے باہر کی محفل میں پہنچتا
 — یہ تین آدمی قودہ تھے جو ہر روز دیو کی شکل دیکھتے ہی صدر دیں کی دکان
 میں جا بیٹھتے تھے اور جب تک کوئی ضروری کام نہ آ پڑتا یا گھر والے سخت امر کر کے
 بدیشیاں نہ کر دیتے۔ وہاں سے اُٹھنے کا نام دلیتے۔ ان کے علاوہ اس محفل کے دو
 فرد مستقل رکمن بھی تھے جو دکان پر پہنچنے میں شاذ و نادر ہی ناخدا کرتے تھے۔ ان میں سے
 ایک نو عظام تراز تھا اور دوسرا کا کا پڑیمار — عظام تراز زہر میں اپنے حلقے کی پھیری
 لگا کر گھومتا تھا چار بجے گھر لوٹتا تھا اور اسی وقت دکان پر پہنچ جاتا تھا کا کا پڑیمار پڑیوں
 سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ہاں یہ فرسبہ کر لڑکھن کے زمانے میں وہ گھٹوں پڑیوں کے
 پیچھے بھاگا پھرتا تھا اور اسی دھڑ سے پڑے مار مشہور ہو گیا تھا۔ اب نو ف صبح صبح ڈوری
 کاتنے لے کر دریا کی طرف نکل جاتا تھا اور دوپہر تک جتنی پھلیاں پکڑ لیتا تھا انہیں
 پھل منڈی یا کہیں اور بیچ کر دو تین بجے گھر واپس آ جاتا تھا اور پھر دن بھر کی تھکاوٹ
 بھی اسے صدر دیں کی دکان میں جانے سے نہیں روک سکتی تھی۔ دیوان سب کو باہر
 کی محفل کہا کرتا اور وہ خدا اس محفل کی روح خدا تھا۔

صدر دیں کی دکان مشکل ڈیڑھ گز چوڑی اور سات گز لمبی تھی۔ اس کے ایک کونے
 میں وہ خود بیٹھا تھا اور دوسرے کونے میں اس کا چھوٹا بھائی شیرا کام کرتا تھا۔ اس مختصر
 سی جگہ میں بیٹھنے کی کچھ زیادہ گنجائش نکالنے کے لئے انھوں نے دکان کے آگے لکڑی کا

کھٹے پر جا کر کبوتروں کی دیکھ بھال کر رہا تھا گھاس کی لگا ہوں تو بچے جھد دیج ہی کی دکان پر جی تھیں۔ علماں واپس اگر گھر سے باہر نہیں نکلا تھا تاہم وہی سوچ رہا تھا کہ اسج دینو کو کیا ہو گیا ہے حجاب تک ہمارے ہاں بوج نہیں سکا۔ کاکا چڑیا گھر میں بیٹھنے کی بجائے صدر دیوار کی دکان پر بیٹھ کر صبح استعمال کی ہوئی ڈوری کے بل نکال رہا تھا۔ نظری اُس کی بھی چوک کے اسی حصے کو دیکھ رہی تھیں جہاں ہر روز دینو کی شکل سب سے پہلے نظر آتی تھی۔

شام ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی کہ دینو اکیلے جس دقت اس نے دکان کے سامنے پہنچ کر اپنے معمول کے مطابق اندر سے لاشی زمین پر مار کر اس میں لپک لپک کر سبکے سر بھٹے ہوئے چمروں پر تازگی آگئی۔ اب خستہ کئے گئے کپڑوں پر استری کرنا مشکل تھا اور اب علماں بھی گھر میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ دونوں باہر نکل آئے تھے۔ مہتاب بھی دکان کی طرف لپے لپے ڈگ بھر رہا تھا سایا نام بھی کبوتروں کو جلدی جلدی کاکوں میں بند کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ گانا سننے سے پہلے کچھ دیر پھینچیاں کتنا یادوں کی محفل کا عام فیوہ تھا مگر اُس دن قودہ پریشان بھی ہو گئے تھے اس لئے دینو کی کچھ زیادہ ہی تواضع کرنی چاہئے تھے۔ جوتے آتے ہی اس کی گردن دیوچ لی اندر گرج کر کہہ: کیوں اوپر گیا! آج برگ پڑ گئی تھی تجھے؟ دینو کو وقتاً فوقتاً برگ کے دوسے پڑتے تھے۔ اس نے سوتے اس کا نام ہی برگیا رکھ دیا تھا۔

کاکا چڑی ماوتے منہ سے ڈوری نکال کر کہہ: گلا گھونٹ دو مردود کا۔ سارا دی عینش کرتا رہا ہے۔

کیوں اسے مردود؟ اندھنوں کی گرفت کچھ اور سخت ہو گئی۔ دینو کا چہرہ سُرخ ہو

گیا۔ ہاتھ پر شکنوں کا جال سا نظر آنے لگا اور اودھ مٹا دکھائی دینے لگا۔

تھوڑا دیر اب مر جاتے کا لہجہ۔ "کا کا پڑا ہوا"۔

صدا کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ دینو نے کرتے کے دامن سے ٹاسک لے لیا۔ پٹریاں جیسے

ہوٹوں پر زبان پھیری اندھے لہجے میں سانس لینے لگا۔

"تجھے گھٹی ٹنگے۔۔۔ کسی کی آئی آئے۔۔۔ تیری ماں مر جائے۔" دینو نے

اپنی طرف سے سب سے خوفناک بددعا دی تھی۔۔۔ بالخصوص ماں کے مر جانے

کی بددعا اس وقت دیا تھا جب وہ غم و غصہ کی آخری سہر پہنچ جاتا تھا۔ مگر جیسے

ایک بند قہقہہ لگا کر اسے گود میں اٹھالیا۔

"اگر پھر کبھی یہاں آیا تو سود کا پتھر ہوں گا۔"

دینو کے اس پہنچ کی بھی کسی نے پروا نہ کی۔ سب ہنس ہنس کے اسے چھیڑ رہے تھے اور

آنے جانے والے لیگ بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھنے میں محو تھے۔

صدا دینو کو گود میں اٹھا کر اندر لے گیا۔ فحش کاریوں کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ ایسے

موقعوں پر صدر دی کی بیوی بڑے غصے میں فود سے دودازہ بند کر دیتی تھی اور کچنوں و اکیلی

اتنے زور سے کہتی تھی کہ ہوک میں آنے جانے والے سب لوگ سُن لیں۔ جہاں پھر اس نے اس

دلی بھی یہی کیا۔ غلام برلا۔ "ہیں بھئی ہیں! اس پاس ہماری مائیں بیٹیاں رہتی ہیں۔ یہ فقرہ صدیوں

کی بیوی کو سنانے کے لئے کہا گیا تھا تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ ان لوگوں کو پاس پہنچنے والی

ماؤں بھول کی عزت کا بڑا احساس ہے۔"

صدا نے ایک منٹ خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

"مگر کیا آج تجھے ہوا کیا تھا؟"

دینو نے اپنی ٹانگ سے تھم ہٹا دیا گھٹنے کے نیچے گزشت چوٹ کی وجہ سے نیلا
 پڑ چکا تھا۔ کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے سارے ساتھیوں کو معلوم تھا کہ
 دینو مرگی کا مریض ہے اور مرگی کا درد کبھی کبھی اس کے جسم پر اپنی کوئی نہ کوئی نشانی بھی
 چھوڑ جاتا ہے۔ وہ اس پر اخبار انٹوس کیا کرتے۔ یہ تو ایک عام واقعہ تھا تاہم اس کا
 یہ فائدہ ضرور ہوا کہ حتمی یاروں کے اصرار پر اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے دینو کے لئے
 آدھ میر دو روہ منگو اس نے پر تیار ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد دینو نے دو دو والا خالی گلاس ایک طرف رکھ دیا ستھ کا بیا کشر لایا۔
 ہاتھ بڑھا کر صمد دیوی کی پشت کی بجانب دکان کے کونے سے گھڑا اٹھایا اور اسے گود
 میں رکھ کر کچھ سوچنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد گھڑے کی آواز کے ساتھ اس کے دل کا سڑ بھی
 بیٹنے کی گرائیڈوں سے پھوٹ پھوٹ کر آواز کی لہروں میں بیٹنے لگا۔

یوسف ذلیخا کے جند شعر گانے کے بعد جب وہ اس شعر پڑھا۔

یوسف آکھ دس ذلیخا کتے گئی جوانی

کے ذلیخا عشق تیرے تے کردی قربانی

تو فضا کی کیفیت ہی بدل گئی۔ ایسا ایم نے اپنی آنکھیں بند کر کے سرویاہ کے ساتھ
 لگا دیا۔ یقیناً اسے اپنی جوانی کی بہاریں یاد آگئی تھیں۔ طالع سر پہلا کر آہیں بھرے لگا۔ کاکا
 پڑ بیہار کے ہاتھ میں ڈوری پکڑی رہ گئی اور وہ ڈوری کے بل ٹکسلنے کی بجائے زندگی کی کسی
 الجھن میں جکڑ کر رہ گیا۔ صمد دیوی کا سنا چڑھے کے دو ٹکڑوں میں سے بڑی تیزی کے ساتھ
 گزرتے ہوئے موٹے دھاگے سے ان کے کناروں کی بیوستہ کرنے لگا۔ یہ اس کا معمول تھا۔
 دینو کی آواز پر اس کے ہاتھوں میں بڑی پھرتی آجاتی تھی۔ شیرے کو اپنی جوانی کا خیال آگیا

اور اسے ایسے کٹوار ہی کا ڈرا دکھ ہونے لگا۔ مناسب آتش باز کو اپنے بھلا زمانہ یاد آگیا۔ جوانی کی آگ بھڑکی تھی مگر لگھ میں ابھی کچھ چنگاریاں زندہ تھیں، اس نے اپنا ہاتھ گھر گھڑاتی ہوئی چھاتی پر رکھ دیا اور سینے کی ساری ہفتم کو ایک ہی بار سمیٹ کر ایک گولہ سا تان کر منہ سے باہر پھینک دیئے کی کوشش کرنے لگا۔ دکان سے کچھ دور چوہا پانچ پچھتے بڑے انہماک سے کھیل میں مصروف تھے کھیل چھوڑ کر بھاگتے ہوئے دکان کے سامنے ٹکڑے۔

دینو کا تاربا اور اپنی دانشی عروسی کے شدید احساس سے لوگوں کے دلوں میں ایک گہرا اثر چھوڑتا رہا۔

چمک بھورام میں رہنے والے لوگوں کی بیشتر تعداد دینو کے بارے میں صرف یہ جانتی تھی کہ وہ سوچی سمجھے کے اندر کس محلے میں رہتا ہے اور ہر روز اپنا دل ہلانے کے لئے مسجد میں کی دکان پر آجاتا ہے۔ اپنی نجی زندگی کے منطلق اس نے کبھی کبھ تانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے بے تکلف ساتھی بھی اس کی گھریلو زندگی کے تمام پہلوؤں سے واقف نہیں تھے اور وہ انہوں نے کبھی واقف ہونے کی ضرورت ہی محسوس کی تھی۔

وہ چمک بھورام سے ایک میل دور موچی ارواڑے کے اندر ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں رہتا تھا۔ اس کی عمر چونتالیس سے اوپر ہو چکی تھی۔ اور کم دھیش میں ساں سے اپنے بھائی کے مکان میں سب میں شامل ہونے کے باوجود سب سے الگ تھا۔ وہ کرنگی بسر کر رہا تھا۔ اس کی زندگی اس حدت میں صرف یہی حادثوں سے روشناس ہوئی تھی اور یہ تینوں حادثے اس کے لئے بڑے اہم ثابت ہوئے۔

پہلا حادثہ اس کی پیادری ماں کے انتقال کا حادثہ تھا۔ ساری دنیا میں صرف ماں ہی اس سے جتنی محبت کرتی تھی۔ اس کے چلنے پھرنے کے بعد اس کا یہ سہارا بھی ختم ہو گیا تھا۔

دوسرا حادثہ اس وقت رونما ہوا تھا جب اس کا باپ ہمیشہ کے لئے دنیا سے ہٹ گیا تھا۔ اس حادثہ کے بعد وہ اپنے آبائی مکان سے نکل کر بھائی کے مکان میں رہتے پر عہدہ ہو گیا تھا۔

تیسرا حادثہ ایک اتھاقی واقعہ تھا!

ایک دن وہ دہلی دروازے کے باہر اپنے بھائی کی دکان پر بیٹھا تھا کہ اس کی دوستی صدیق کوچی سے ہو گئی۔ اس کا بھائی چرٹے کا بیرو پارہ تھا اور صدیق چٹوہ وغیرہ خریدنے کے لئے اکثر اس کے پاس آیا کرتا تھا۔ دونوں پسلی ہی ملاقات ہیں ایک دوسرے کے کافی قریب ہو گئے۔ دیر اس زمانے میں ناقابل برداشت تنہائی محسوس کر رہا تھا اور صدیق کو گانا سننے سے بڑی دلچسپی تھی۔ پہلی ملاقات کے چند روز بعد صدیق اسے اپنی دکان پر لے آیا اور پھر دوستی بڑھ گئی یہاں تک کہ وہ صدیق کے باقی دوستوں سے بھی گھل جلا گیا۔

یہ آخری حادثہ تھا اور اس کے بعد کوئی اور حادثہ واقع نہ ہوا۔

اس شام کے بعد پودے چار دی گزر گئے اور دینو دکان پر نہ آیا۔ مایا رام کا خیال تھا کہ دینو کو کچھ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے وہ یادوں کی محفل میں شریک نہیں ہو سکا۔ وہ اپنے بھائی یا کسی کے نوک دیکھنے سے نہیں روک سکتا۔ باقی لوگوں کی بھی یہی رائے تھی اور سب کے سب اس کی عدم موجودگی کو بُری طرح محسوس کر رہے تھے۔

اگلے دن مہتاب نے اطلاع دی کہ مرگی کے دورے میں دینو کی ایک ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ اور اب وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا۔ یہ خبر سن کر شخص پریشان ہو گیا اور محسوس کرنے لگا جیسے اسے کوئی ذاتی صدمہ پہنچا ہے جس نے اسے نڈھال کر دیا ہے۔

سب سے زیادہ فکر محو کر پڑی اور یہ ہانتے ہوئے بھی کہ دینوکے گھر والے ان لوگوں کو پسند نہیں کرتے، وہ مدد دی اور شیرے کو ساتھ لے کر دینوکے گھر روانہ ہو گیا۔ راہ میں انھوں نے کچھ پھل خرید کر جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے دینوکے یہاں پہنچ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی حقہ چیت کرنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر دینوکے ٹانگ پر پڑی اور وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔

دینوکے ٹانگ سے چکی تھی اور وہ درد سے بے تاب ہو کر ہائے ہائے کر رہا تھا۔ تینوں اس کے سامنے بیٹھ گئے مگر دینو نے منہ پھیر لیا۔ کیا بات ہے چاہا دینو؟ شیرے کی آواز بھردی کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ کیا ہے؟ دینو نے کسی کو مخاطب کئے بغیر کہا۔

یار میں تو خبر ہی نہ ہوتی کہ تیری یہ حالت ہو گئی ہے۔ صعدہ بی بی بولا۔ دینو نے اس مرتبہ بھی ان کی طرف پلٹ کر نہ دیکھا۔ خاموش رہ کر آہستہ آہستہ بخروٹ ٹانگ سے ہر انگلیاں پھیرتا رہا۔

ہائے خائے بڑا بڑا سال ہو گیا ہے چاہا کا۔ حضور دہلا لایا ہے ارمان اٹھائے گا انشاء اللہ شیرادینوکے تکلیف نوری طرح محسوس کر رہا تھا۔

دینو کا دل اس بات پر بھی نہ سمجھا اور شیرا اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ حساب تک بڑے صبر سے ساتھ ان کی گفتگو میں رہا تھا، مگر اب دینوکے بے نیازی دیکھنا خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے ذرا آگے بڑھ کر دینوکے ٹانگیں ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا اور غصہ سے بولا۔

نہیں اور مر گیا! ہم نہیں غصے دیکھتے نہیں آتے۔ سبھی طرح بات کرتا ہے کہ

مشوک ہی بنا رہتا ہے۔“

ماسے دود کے دین کی چیتیں نکل گئیں۔ اور پھر دونوں طرف سے گالی گلوچ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ صدد دی پریشان ہو گیا۔ اس نے سرچا اگر دین کی بھابی نے گالیوں کی آواز سُنی تو نتیجہ بہت بُرا ہو گا۔ چنانچہ اس نے اپنا ہاتھ صو کے منہ پر رکھ لیا۔

صو نے گالیاں دینا تو بند کر دیا مگر اسی لمحے ایک قصاب کی سی بے رحمی کے ساتھ دین کی مجروح ٹانگ پر ہیل پڑا۔ اس کی انگلیاں لوسے کی سلاخوں کی طرح گوشت پر دباؤ ڈالتی ہوئی شکستہ ہڈی کو چوڑنے لگیں۔ دین اس بکوسے کی طرح تڑپ رہا تھا جس کے گلے پر چھری پھیری جا رہی ہو۔ صدد دی ویسی اند شیر اگھر گئے اور ان کی نگاہیں کچھ نہیں آتا تھا کہ اچھے دوست کو اس تکلیف سے کس طرح بچائیں اور کس طرح صو کو زباناں سختی کرنے سے منع کریں۔

”ذرا ہولے ہوئے بھابی! صدد دی بولا

ہندو دی اور ذہنی تکلیف کی وجہ سے دوتوں کے گلوشے چمٹے پتھر سے اس طرح نظر آ رہے تھے جیسے ابھی دو پٹریں گے۔ ان کے مقابلے میں صو کے چہرے پر صدد دی کا وہ برابر نشان بھی نظر نہ آتا تھا۔ اس کا بیٹھے تیل سے لت پت ہاتھ ہڈی اور گوشت سے برابر نکلتی ریشے میں مشغول تھا۔ خدا خدا کر کے صو کی گرفت کچھ ڈھیل پڑی۔ اس نے مجروح ٹانگ پر دوا لگا کر پٹی باندھ دی۔

دین کا رنگ درد کی شدت سے ندوڑ چلا تھا۔ ماتھے اور ٹانگ کے اوپر جابجا پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے اور کمزندی اس قدر تھی کہ وہ وہیں چٹائی پر ڈھیر ہو گیا۔

ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگے اور تہذیب و تمدن کا سب سے قیمتی سرمایہ مٹی کی کپڑوں کی گندی تالیوں میں بسنے لگا۔

دیو کو بالکل خبر نہیں تھی کہ اس کی مٹی کے باہر شرمی کیا ہوتا ہے۔ اسے حیرت صرف اس بات پر تھی کہ اس کے ساتھی کئی دن سے اس کے پاس نہیں آ رہے۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ ابھی تک کوٹھڑی سے باہر نکلنے کے قابل ہی نہیں ہوا تھا۔ اگر اس کی حالت ٹھیک ہوتی تو وہ ہر شام کو اپنے ساتھیوں کا انتظار کرنے کی بجائے خود دکان پر پہنچ جاتا اور اس سے نیاز خواہان کی خوب خبر لیتا۔

اس کے ساتھی اس کے پاس نہیں آ رہے تھے مگر یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے وہ سمجھ لیتا کہ آٹھ وہ کبھی آئیں گے ہی نہیں۔ یادہ ان کی صحبت سے بے گھر کے لئے عزم ہو گیا ہے۔ وہ ہر روز دو تین گھنٹے ان کا انتظار کرتا رہتا اور جب وہ نہ آتے تو دل کا جبار لگانے کے لئے اکیلے ہی گھڑا بھجی کر کاٹا دیتا اور پھر سو جاتا۔

آٹھ دن گزر گئے اور وہ اپنے ارد گرد ایک تبدیلی سی محسوس کرنے لگا۔ اس کی بھابی صبح و شام گھر کے صحن میں دوٹیاں پکاتی تھی مگر اب بچے ایک دوسرے کی بدلتی ڈالنی چھین کر چھینے بدلتے نہیں تھے۔ اس کا بھائی دکان پر مزدور بننا تھا لیکن واپسی پر حصہ لے کر کچھ دیر کے لئے اس کی کوٹھڑی میں نہیں آتا تھا۔ اور پھر کئی دن سے مٹی کے اندر تو خواہ مخواہ خوشی اور فیتروں کی سدا میں بلند ہوتی تھیں اور نہ محض کی عورتیں بچوں کے مٹا لے ہیں آپس میں لڑتی ہی تھیں۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ یہ کیسی تبدیلی آگئی تھی۔ یہ کیا ہوئے بالہ تھا۔ دیو سوچتا تھا مگر کچھ سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اپنی ناک پر طحی بھابی سے اس نے اس تبدیلی کی نوعیت پر بھی تو وہ صرف یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔ ”مجھے خبر نہیں کیا ہو رہا ہے۔ مجھ سے کہا تو پچھتا ہے“

دو شاہیں اور انتظار کرتے گزر گئیں اور اس کے سامنے نہ آئے۔ اس نے مجھ پر ہر جہانی کو آواز دی۔ بھائی اندر آ گیا۔

”کیا ہے؟“ بھائی کا لہجہ بڑا سخت تھا۔

”یاد میں کتابوں یہ صدرا اور اکبریں نہیں آتا آج کل؟“ دوسرے پرچہ۔

”خیر میں غلط خراب ہو رہا ہے اور تجھے اپنی پڑی ہے؟“

”خون خراب؟“ دوسرے پرچہ۔

”خود ہو رہا ہے چاہا انگریز سے بہرہ نہ لکھا۔ کس لب مان؟“

اور یہ کہہ کر اس نے بھائی کو تھوڑی سی سے تھک گیا۔

اپنی زندگی میں دو نہیں بار پہلے بھی اس نے قناد کا بٹرنٹ تھا مگر اس بار تو کبھی ہوا ہی نہ

تھا کہ کوئی ٹھکانے کے مارے ٹھہرے۔ باہر ہی نہ لنگھے یا گلیاں اور بازار بائسکی ویراں پر جانیں

پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایسی تبدیلی تو اس نے پہلے کبھی محسوس ہی نہیں کی تھی۔ یہ کیسا

فساد تھا جسے سارے کے سارے محلے کو ایک خبر سنا کر بنا دیتا تھا۔

اس شام کو پریشانی کے عالم میں وہ آدھی رات بھی نہ کھانا صرف چند نئے طبقے سے

انار، نمکے بعد لیتا تھا۔ اور اس پریشانی سے نہات ماحول کرنے کی خاطر بیعت افلوک

شعر لگاتے تھے۔

صبح بیدار ہوا تو اس کی طبیعت بڑی اوساں تھی اور اس طبیعت کو کئی دن سے رستی تھی

مگر اس دن نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کے اعضاء ایک بھاری بوجھ کے نیچے دبے جا رہے

تھے۔ اپنے ہاتھوں سے حقائق کے حرف دو چھتے گزر رہے تھے لیکن وہ محسوس کر رہا تھا

جیسے وہ کل دو سال سے قید و بند کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اپنے دل کی کیفیت وہ کسے

جانے کا اور کبھی واپس اس مغروس گھر میں نہیں آئے۔ گدا اور یہ سوچ کر اس کے دل کا کنول کھل اٹھا اور وہ کوٹھڑی سے باہر جا بیٹھا۔ اب اسے بھابی کے ہتھکے کی کوئی پروا نہ تھی کیوں کہ وہ اس گھر سے ہمیشہ کے لئے چلے جانے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا اور اس وقت بھی اپنے ساتھیوں کو اور گرد بیٹھا ہوا مغروس کر رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد جب وہ واپس کوٹھڑی میں پہنچا تو اس کے دل میں ایک نئی آہنگ پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے سینے میں ایک تیا ولولہ شردشاں تھا اور وہی شناسا آواز میں اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ تھیں بھاسے دیکھتے ہی دیکھتے ایک طوفانی نشاط بھی کر اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی تھیں۔

دوسرے دی صبح کے وقت ابھی گھر کے تمام افراد اوپر کھٹے ہی پرستے کہ وہ چاہائی سے اٹھ کر دسے پاؤں اپنی کوٹھڑی میں پہنچا

اپنے بچے ہاتھ سے اس نے گھر سے کوٹھالا اور چاہائی کے نیچے سے لاکھی نکال کر دے اسے بغل میں داب کر باہر نکل آیا۔ گھر کے قریب کسی شخص کی نظر اس پر پڑی مگر جب وہ گئی تو بکھوہو گیا تو عہد اللہ بنا کو نروژ کی آواز اس کے کان میں آئی۔

کہاں دیر؟

”کیوں نہیں۔ خدا مہر بخش کے گھر تک بارہا ہوں۔ گھر میں بچے بیٹھے خاک گی ہوں دیر“ نے جواب دیا۔ مہر بخش جی سے کچھ لہو رہتا تھا اور دیر کئی بار اس کے گھر جا چکا تھا۔

”تجہ میں جی آؤں گا۔ یہ آج کل تو زندگی حرم ہو گئی ہے۔“

اور پھر عہد اللہ کے پاؤں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔

پہلے جب کبھی جی سے باہر نکلتا تھا تو سر طرف شہر مڑا ہوتا تھا۔ لیکن اس دن ایک

برہا ہو گیا ہے تاہی ہے اس کا ہاتھ زہی پر لٹھی تلاش کرنے لگا۔۔۔۔۔ اسے لٹھی مل گئی اور گھر سے کا ایک ٹکڑا بھی جسے نہ جاننے اس نے کیوں اٹھا لیا تھا شاید وہ اسے پورا ٹکڑا سمجھ رہا تھا۔ اور ایک بار پھر وہ دیران اور سنان سے ٹکرا رہا ہے گرم گرم اور کھٹکھٹ لگا رہتا ہوا قدم اٹھانے لگا۔۔۔۔۔ اس کی ناگھیں اور گھر سے ہی تھیں۔ اس کا سانس اٹھ رہا تھا گروہ چلا جا رہا تھا۔ ایک طرفانی عزم کے ساتھ۔۔۔۔۔ ایک ناقابل شکست اور اسے کوٹے ہوئے۔۔۔۔۔ آخر گر گر کر بیٹھتا ہوا، سنبھل سنبھل کر گرتا ہوا وہ چوکس میں داخل ہو گیا۔ ہاں بھی وہی خاموشی تھی۔ وہی دیرانی تھی۔

”یہ! یہ کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ میں کہاں آگیا۔“

اور وہ تیری سے آگے بڑھنے لگا جیسے ابھی ساری کی ساری آوازیں گونج اٹھیں گی۔
 ————— پیسے ابھی تمام کے تمام ساتھی اس کی طرف جنگ آئیں گئے مگر کوئی آواز
 نہ گونجی۔ کوئی ساتھی اس کی طرف نہ آیا۔ ————— محلّے بھر کی زندگی ڈر کے مارے
 مکانوں کی چار دیواری کے نیچے جا چھپی تھی۔ ————— صدے! آس نے گوتے گوتے
 آواز دی۔ دوبارہ آواز دی اور پھر گر پڑ۔ دکان کے عین سامنے۔ اس کی خوی آواز اٹھکیاں کٹی
 محلّے دکان کے نیچے کڑی کے تختے کو مس کرتی رہی۔ ————— اور صدے صدے نکلتی
 ہوئی ایک منہل سی باریک آواز اُس کے منہ سے نکلتی رہی +

میری لاٹری میں سلسلہ طنز و مزاح

۱/۵۰	ہوس	} شفیق الرحمن
۱/۵۰	پرداز	
۴/۵۰	ساتھیں	
۳/۵۰	مزہ ہاقتیں	
۱/۵۰	سنگ دشت	
۱/۵۰	شیخہ دیشہ	
۱/۵۰	ہنگ دیشہ	
۱/۵۰	گود کاروں	
۱/۵۰	نام گرم	
۱/۵۰	باغ	
۲/۵۰	دیا گھر	} کنیا لال کھنڈ
۲/۵۰	توتی آشتہ	
۱/۵۰	توتی	
۱/۵۰	گرم	
۱/۵۰	اشفاق احمد خان (سلیف)	
۱/۵۰	شوکت محمود (کارٹون)	
۱/۵۰	مشتاق احمد پسنی	
۱/۵۰	مرتہ ڈاکٹر وحید قریشی	
۱/۵۰	نور کا بہترین طنز و مزاح	
۱/۵۰	اردو کا بہترین انشائی ادب	
۱/۵۰	اردو میں شخصیت نگاری	
۱/۵۰	احمد بہال پاشا	}
۱/۵۰	شوکت نرائی	

میری لائبریری کا سلسلہ تاریخ و سوانح

۶/۰۰	محمد حسین بیگلر	ابوبکر صدیق اکبر
۱۲/۰۰	محمد حسین بیگلر	عمر فاروق اعظم
۴/۰۰	محمد انصاری بانی ہجری	دس بڑے مسلمان
۵۰/۰۰	ابوزید غسانی	ناراضیہ اللہ
۲/۲۵	شہنشاہ نعمانی	الماہرون
۲/۲۵	عمر ابو النصر	الہارون
۱/۵۰	عمر ابو النصر	المحسین
۱/۰۰	عمر ابو النصر	الزہراء
۲/۰۰	عبد الحمید جدۃ السحار	ابوزید غفاری
۱/۵۰	محمد مصطفیٰ صفوت	سلطان محمد فاتح
۱/۵۰	فداوار السکاکی	راہبہ بصری
۲/۵۰	فیاض حسین	دوبہ متی
۲/۷۵	آرتھر ویگل	قلو بطرہ
۳/۷۵	جمال پاشا الغزنی	صلح فی محلوں کے بارے
۱/۲۵	امین ڈکریا	امیر معاویہ
۱/۲۵	احمد زکی صفوت	عمر بن عبد العزیز
۱/۲۵	عبد العزیز سید الاصل	امام زین العابدین
۳/۷۵	ابو الکلام آزاد	تذکرہ
۲/۵۰	ڈیل کارنگی	ہائیں زمانیں (یا تصویر)
۱/۵۰	عظیم غلام حیدر سیل	شیخ عبد القادر جیلانی
۴/۰۰	ڈیل کارنگی	کامیاب لوگوں کی دلچسپ کہیں
۳/۷۵	۰ ۰	۳۹ - بڑے آدمی